اس شمارے میں

حرفِ اوّل

صدر مؤسس کا دورۂ بھارت — حافظ خالد محمود خضر — ۲

مطالعۂ قرآن حکیم

تعارفِ قرآن (۱) — ڈاکٹر اسرار احمد — ۳

نباتاتِ قرآن

زیتون — سیّد قاسم محمود — ۲۶

دعوت رجوع الی القرآن

قرآن کا پیغام، بارہ اسباق میں — نعیم صدیقی — ۳۱

فہم القرآن

ترجمہ قرآن مجید — لطف الرحمٰن خان — ۴۳

حکمت نبویؐ

دنیاوی تکلیفوں کی حقیقت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — ۵۵

خطوط و نکات

''خوار از مہجوریٔ قرآں شدی'' — حاجی فضل رحیم — ۵۹

تعارف و تبصرہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — ۶۱

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

قرآن اکیڈمی لائبریری

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حافظ عاطف وحید

جلد ۲۴ ذوالقعدہ ۱۴۲۵ھ - جنوری ۲۰۰۵ء شمارہ ۱

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرتعاون: 100 روپے' فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم صدر مؤسس کا دورۂ بھارت

مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ اپنے دورۂ بھارت کی تکمیل کے بعد ۲۵ دسمبر کو لاہور تشریف لے آئے ہیں۔ یہ دورہ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن انڈیا کے صدر جناب ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر تشکیل دیا گیا تھا۔ بھارت میں اپنے ۳۲ روزہ قیام کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے دہلی، علی گڑھ، ممبائی، پونا، بنگلور اور حیدر آباد میں بہت بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ دہلی میں آپ کا قیام چھ روز رہا جس کے دوران متعدد اجتماعات سے خطاب کا موقع ملا، جن میں ہمدرد یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور جماعت اسلامی ہند کیمپس میں لیکچرز کے علاوہ جامع مسجد دہلی میں خطابِ جمعہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر پروگرام میں ہزاروں مرد و خواتین نے شرکت کی۔ ممبائی میں مسلسل دس روز تک آپ کے دروس و خطابات کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں مرد و خواتین کی روزانہ حاضری پندرہ ہزار تک رہی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آپ کے خطابات کے دوران یونیورسٹی کے وسیع و عریض ہال اپنی تنگ دامانی کا گلہ کرتے نظر آئے۔ صنم خانۂ ہند میں ایک داعی الی القرآن کی اس پذیرائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خطے میں دعوت رجوع الی القرآن روز افزوں فروغ پذیر ہے اور قرآن حکیم کی قوتِ تسخیر ہندوستان کو مسخر کر کے رہے گی۔ اس دورے کی ایک مختصر رپورٹ، ان شاء اللہ العزیز، آئندہ شمارے میں نذر قارئین کر دی جائے گی۔

☆ ☆ ☆

موجودہ شمارے سے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے خطابات پر مشتمل ''تعارفِ قرآن'' کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے چند سال قبل اپنے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے چار خطابات میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو فرمائی تھی۔ ان خطابات کو تحریری صورت میں قارئین حکمت قرآن کے سامنے پیش کرنا ہماری دیرینہ آرزو تھی جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب پوری ہو رہی ہے۔

انسانوں کے لئے قرآن حکیم کا مرکزی پیغام ''اُعْبُدُوْا رَبَّکُمْ'' ہے۔ جناب نعیم صدیقی مرحوم کا مضمون ''قرآن حکیم کا پیغام بارہ اسباق میں'' اسی پیغام اور اس کے تقاضوں کی وضاحت کرتا ہے۔ لطف الرحمٰن خان صاحب کے قلم سے ''ترجمہ قرآن مجید مع صرفی و نحوی تشریح'' پر مشتمل سلسلۂ اسباق حافظ نذیر احمد ہاشمی صاحب کی نظر ثانی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں سید قاسم محمود صاحب کا قسط وار سلسلہ ''نباتاتِ قرآن'' اور ''حکمت نبویؐ'' کے زیر عنوان پروفیسر محمد یونس جنجوعہ صاحب کا درس حدیث بھی شاملِ اشاعت ہے۔ پرچے کو مزید بہتر بنانے کے لئے ہمیں قارئین کی آراء کا انتظار ہے۔

تعارفِ قرآن

از: ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الزخرف)

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ
لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الواقعۃ)

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ

تعارفِ قرآن مجید کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا ایمان' یا اصطلاحِ عام میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟

قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱) قرآن اللہ کا کلام ہے۔

۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے' اور کُل کا کُل مِن وعَن موجود ہے' اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے' قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔لیکن انہی تین جملوں کے بارے میں اگر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے اور دقت نظر سے ان پر غور کیا جائے تو کچھ علمی حقائق سامنے آتے ہیں۔تمہیدی گفتگو میں ان میں سے بعض کی طرف اجمالاً اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام

سب سے پہلی بات کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے' خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ﴾

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے اس کے مأمن تک پہنچا دو۔''

جب سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں مشرکین عرب کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو اشہرِ حُرم کے خاتمے کے بعد تمہارا قتل عام شروع ہو جائے گا' تو اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو ایک ہدایت یہ بھی دی گئی کہ یہ الٹی میٹم دیئے جانے کے بعد اگر مشرکین میں سے کوئی آپ کی پناہ طلب کرے تو وہ آپ کے پاس آ کر مقیم ہو اور کلام اللہ کو سنے' جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ وہیں اس سے مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ کرو کہ آیا تم ایمان لاتے ہو یا نہیں۔اس وقت میں نے اس آیت کا حوالہ صرف ''کلام اللہ'' کے الفاظ کے لئے شہادت کے طور پر دیا ہے۔

کلام الٰہی: جملہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر:

قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں ہی اس کی اصل عظمت کا راز مضمر ہے۔اس

لئے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور اس میں متکلم کی پوری شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کسی بھی شخص کا کلام سن کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے علم اور فہم و شعور کی سطح کیا ہے۔ آیا وہ تعلیم یافتہ انسان ہے' مہذب ہے' متمدن ہے یا کوئی اجڈ یا گنوار ہے۔ اس اعتبار سے درحقیقت یہ کلام اللہ' اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا مظہر ہے' اس میں اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثل حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

(جو بات میرے دل میں چھپی ہوئی ہے وہ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ قرآن کتاب نہیں ہے' کوئی اور ہی شے ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے' نیز یہ کلام بھی کرتا ہے۔)

مختلف مفاہیم و معانی کے لئے اس شعر کا حوالہ دے دیا جاتا ہے' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں اس کے ''چیزے دیگر'' ہونے کا کون سا پہلو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس میں درحقیقت سورۃ الحدید کے اس مقام کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (آیت ۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ الاوّل بھی ہے اور الآخر بھی' وہ الظاھر بھی ہے اور الباطن بھی۔ اسی طرح علامہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت الحیّ القیوم ہے اسی طرح یہ کلام بھی زندہ و پائندہ ہے' ہمیشہ رہنے والا ہے۔ پھر یہ صرف کلام نہیں' خود متکلم ہے۔

یہاں کلام اور متکلم کے مابین فرق کے حوالے سے متکلمین کی اس بحث کی طرف

اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ حق کی صفات' ذات سے علیحدہ اور مستزاد کوئی شے ہیں یا عین ذات؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس بحث کا ذکر کیا ہے ۔

ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عین ذات؟
اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

یہ علم کلام کا ایک نہایت ہی پیچیدہ' غامض اور عمیق مسئلہ ہے' جس پر بڑی بحثیں ہوئیں اور بالآخر متکلمین کا اس پر تقریباً اجماع ہوا کہ ''لَا عَیْنٌ وَّلَا غَیْرٌ'' یعنی اللہ کی صفات کو نہ اس کا عین قرار دیا جا سکتا ہے نہ اس کا غیر۔ اگر اس حوالے سے غور کریں تو قرآن حکیم بھی' جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اسی کے ذیل میں آئے گا' یعنی نہ اسے اللہ کا غیر کہا جا سکتا ہے نہ اس کا عین۔ چنانچہ اس حوالے سے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ قرآن مجید کی فی نفسہ عظمت کے ضمن میں اہم ترین ہے :

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا' اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔''

اس تمثیل کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طلبی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر حاضر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ وہی طلبی تھی جس میں آپ علیہ السلام کو توراۃ عطا کی گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطبہ و مکالمہ سے سرفراز فرمایا تو ان کی آتش شوق کچھ اور بھڑکی اور انہوں نے فرمائش کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار عطا فرما''۔ مخاطبہ و مکالمہ کے شرف سے تو نے مجھے مشرف فرمایا ہے' اب ذرا مزید کرم فرما۔ اس پر جواب ملا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ ''(موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے!'' ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ﴾ ''لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو'' میں اس پر اپنی

ایک تجلی ڈالوں گا۔ ﴿فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي﴾ چنانچہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو پھر تم مجھے دیکھ لو گے"۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ "پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ "دَکًّا دَکًّا" ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔"

یہاں "دَکًّا" کے دونوں ترجمے کئے جا سکتے ہیں' یعنی ریزہ ریزہ ہو جانا' ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا' اور ایک یہ کہ کوٹ کوٹ کر کسی شے کو ہموار کر دینا' برابر کر دینا۔ جیسے سورۃ الفجر کی آیت ﴿كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾ میں ان معنوں میں وارد ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں پہاڑ کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا یا دب گیا' زمین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ تجلی دیکھی جو بالواسطہ تھی' یعنی براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں بلکہ پہاڑ پر تھی اور حضرت موسیٰؑ بالواسطہ اس کا نظارہ کر رہے تھے' لیکن خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہوئی کہ ﴿خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ "حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔"

یہاں ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی بحث کا ایک عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ دب گیا یا پھٹ گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' اسی طرح قرآن مجید کے متعلق فرمایا:

﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾

یعنی کلام اللہ کی بھی وہی کیفیت اور تاثیر ہے جو کیفیت و تاثیر تجلیٔ ذاتِ الٰہی کی ہے۔ اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی صفت ہے۔ تو تجلیٔ صفات اور تجلیٔ ذات میں کوئی فرق نہیں۔

البتہ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس بارے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ علامہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کئے کہ ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری وتبسمی!

علامہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقابل کر رہے ہیں کہ وہ تو تجلیٔ صفات ہی

سے بے ہوش ہو کر گر گئے' لیکن اے نبیؐ! آپ نے عینِ ذات کا دیدار کیا اور تبسم کی کیفیت میں کیا۔ اس میں دو اعتبارات سے مغالطہ پایا جاتا ہے۔ اوّل تو وہ تجلّی' تجلّیٔ صفات نہیں تجلّیٔ ذات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر ڈالی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود متجلی ہوا۔ دوسرے یہ کہ یہ خیال بھی مختلف فیہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ ہمارے اسلاف میں یہ رائے بھی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے' لیکن اکثر و بیشتر کی رائے اس کے برعکس ہے' اس لئے کہ وہاں بھی ''آیات'' کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آیات' جو وہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے دیکھیں' اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

﴿اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۝ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ۝﴾

''اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اُس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

اب اُس سے زیادہ بڑی آیات اور اس سے زیادہ بڑی تجلّیٔ الٰہی اور کہاں ہو گی؟ لیکن دونوں اعتبار سے اس شعر میں مبالغہ ہے۔ البتہ اس آیۂ مبارکہ اور اس کے حوالے سے علامہ کے اس شعر

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

میں میرے نزدیک قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اور اس آیت مبارکہ کے حوالے سے وہ بات کہی جا سکتی ہے جو علامہ اقبال نے اس شعر میں کہی ہے۔

تورات کی گواہی:

اب ذرا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے حوالے سے ایک اور بات ذہن نشین

کر لیجئے۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفر استثناء جو صحف موسیٰ میں سے ایک صحیفہ ہے کے اٹھارہویں باب میں نبی اکرم ﷺ کے لئے جو پیشین گوئی بیان کی گئی ہے اس میں الفاظ یہی ہیں کہ:

''میں ان کے بھائیوں میں سے ان کے لئے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ اُن سے وہی کچھ کہے گا جو مَیں اس سے کہوں گا''۔

مَیں نے یہاں خاص طور پر ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ ''مَیں اُس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔'' یہاں ایک تو لفظ کلام آیا ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی اس آیت میں آیا: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ پھر ''کلام مُنہ میں ڈالنا'' کے حوالے سے قرآن مجید میں ایک لفظ دو مرتبہ آیا ہے، وہ لفظ ''قول'' ہے یعنی قرآن کو قول قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الحاقہ میں ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾

اور سورۃ التکویر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾

اور اسی میں آگے چل کر آیا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝﴾

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان دو مقامات میں سے مؤخر الذکر کے متعلق تقریباً اجماع ہے کہ یہاں حضرت جبرئیلؑ مراد ہیں۔ گویا قرآن کو اُن کا قول قرار دیا گیا۔ اور سورۃ الحاقہ میں اسے نبی اکرم ﷺ کا قول قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں جن چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے کہ ''یہ کسی شاعر کا قول نہیں'' اور ''یہ کسی کاہن کا قول نہیں'' ان سے یقیناً رسول کریم ﷺ مراد ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اللہ کا کلام پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اگر مَیں کتاب استثناء کے الفاظ استعمال کروں تو یہاں ''اللہ نے اپنا

کلام ان کے مُنہ میں ڈالا''۔ تاہم ''اُن کے مُنہ'' کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے' وہ نہایت جلیل القدر فرشتے ہیں۔ بہر حال قول کا لفظ قرآن مجید کے لئے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتداءً کلامِ الٰہی حضرت جبرئیلؑ کے قول کی شکل میں اترا اور پھر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعے سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے مُنہ میں ڈالا گیا' اور وہاں سے یہ قولِ محمد ﷺ کی صورت میں لوگوں کے سامنے آیا' اس لئے کہ آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا' لوگوں نے صرف آپ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا۔ گویا یہ قول' قولِ شاعر نہیں' یہ قولِ کاہن نہیں' یہ قولِ شیطان الرجیم نہیں' بلکہ یہ قولِ رسولِ کریم ہے اور رسولِ کریم اوّلاً محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' یہ لوگوں کے سامنے ان کے قول کی حیثیت سے آیا۔ پھر ثانیاً یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا قول ہے' اس لئے کہ انہوں نے یہ قول حضورؐ کو پہنچایا۔ اور اس کو آخری درجے تک پہنچانے پر یہ اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق تورات میں الفاظ آئے کہ ''مَیں اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔''

لوحِ محفوظ اور مصحف میں مطابقت:

کلام ہونے کے حوالے سے تیسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ کلام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مادیت اور جسمانیت سے ماوراء ہے۔ چنانچہ کلام اللہ حرف و صوت و رسم سے اعلیٰ' منزّہ' ارفع' مبرّا اور ماوراء بلکہ وراءُ الوراء ہے۔ لیکن انسانوں کی ہدایت کے لئے اس نے حروف و اصوات کا جامہ پہنا۔ اور پھر یہ اللہ ہی کے پاس لوحِ محفوظ میں درج ہے جسے اُمّ الکتاب یا کتابِ مکنون بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے پاس موجود قرآن مجید یا مصحف اس کی نقل بمطابق اصل ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کسی دستاویز کی مصدقہ نقل ہے۔ چنانچہ سورۃ البروج میں فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾

''یہ قرآن نہایت بزرگ و برتر ہے اور یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔''

اسی کے متعلق سورۃ الواقعہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۙ﴾

''یہ تو ایک کتاب ہے بڑی کریم' بہت باعزت' اور ایک ایسی کتاب ہے جو چھپی ہوئی ہے۔ جسے چھو ہی نہیں سکتے مگر وہی جو بہت ہی پاک کر دیئے گئے ہیں''۔

یعنی ملائکہ مقربین' جن کے بارے میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۙ﴾ (عبس)

''یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ کتاب مکنون ان فرشتوں کے پاس ہے' وہ تو تمہاری رسائی سے بعید و ماوراء ہے۔ میں پھر وہی الفاظ استعمال کر رہا ہوں' یہ درحقیقت نقل بمطابق اصل ہے جو تمہیں عطا کی گئی ہے۔

یہی بات سورۃ الزخرف میں کہی گئی ہے:

﴿وَاِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۙ﴾

''یہ تو درحقیقت اصل کتاب میں ہمارے پاس محفوظ ہے' بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب''۔

اُمّ کا لفظ جڑ اور بنیاد کے لئے آتا ہے۔ اسی لئے ماں کے لئے بھی عربی میں لفظ ''اُمّ'' استعمال ہوتا ہے' کیونکہ اسی کے بطن سے اولاد کی ولادت ہوتی ہے' وہ گویا کہ بمنزلۂ اساس ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اصل اساس اس لوحِ محفوظ میں ہے' کتابِ مکنون میں ہے۔ مزید وضاحت کر دی گئی کہ ''لَدَيْنَا'' یعنی وہ اُمّ الکتاب جو ہمارے پاس ہے' اس میں یہ قرآن درج ہے۔ ''لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ'' اس قرآن کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت بلند و بالا اور حکمت والا ہے' مستحکم ہے۔ وہ اللہ کا کلام اور نہایت محفوظ کتاب ہے۔ اسے لوحِ محفوظ کہیں' کتابِ مکنون کہیں' یا اُمّ الکتاب کہیں' اصل قرآن بہرحال وہاں ہے۔ وہ کلامِ الٰہی جو اصوات و حروف سے مبرا' منزہ اور ماوراء تھا' پھر اُس نے اصوات و حروف کا جامہ پہنا' اسی عالمِ غیب میں' اُسی عالمِ اَمر میں اصل شکل

میں ہے۔ البتہ اس کی تنزیل محمد رسول اللہ ﷺ پر ہوئی ہے اور اس تنزیل کی مصدقہ نقل ہمارے پاس مصاحف کی شکل میں محفوظ ہے۔

کلام الٰہی کی تین صورتیں:

جب میں نے عرض کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے کس طرح ہم کلام ہوتا ہے! قرآن مجید میں اس کی تین شکلیں بیان ہوئی ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴾ (الشوریٰ)

''کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ برتر اور صاحب حکمت ہے۔''

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہے' اللہ تو ہر شے پر قادر ہے' وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے' بلکہ کہا کہ انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے' کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے' سوائے تین صورتوں کے' یا تو وحی یعنی مخفی اشارے کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی رسول (رسولِ ملَک) کو بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتا ہے۔

اب کلامِ الٰہی کی مذکورہ تین شکلیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے دو کے لئے لفظ وحی آیا ہے۔ درمیان میں ایک شکل ''مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ'' بیان ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ اور یہ تو امر واقعہ ہے ہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اس صورت میں کلام فرمایا۔

پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو وہاں مخاطبہ ہوا۔ یہ مخاطبہ اور مکالمۂ الٰہی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' ہوا تھا' اسی لئے تو وہ آتش شوق بھڑکی تھی کہ ؎

کیا قیامت ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

ظاہر ہے کہ جب ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے تو ایک قدم اور باقی ہے کہ مجھے دیدار بھی عطا ہو جائے' لیکن یہ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھا۔ نبی اکرم ﷺ سے یہی مخاطبہ شب معراج میں پردے کے پیچھے سے ہوا۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ (یعنی ذاتِ الٰہی) کا دیدار حاصل ہوا' لیکن میری رائے سلف میں سے ان حضرات کے ساتھ ہے جو اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی اہمیت کی حامل ہیں' انہوں نے حضور ﷺ سے لازماً ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا ہوگا' چنانچہ ان کی بات کے متعلق تو ہم یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ سے مرفوع ہے۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ''نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی؟'' یعنی اللہ تو نور ہے' اسے کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ نور تو دوسری چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے' نور خود کیسے دیکھا جا سکتا ہے! بہرحال میری رائے ہے کہ یہ گفتگو بھی من وراء حجاب تھی۔ وہ وراء حجاب گفتگو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر مکالمہ و مخاطبہ میں نصیب ہوئی' اسی وراء حجاب ملاقات سے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں ''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى'' مشرف فرمایا۔

البتہ وحی براہِ راست بھی ہے' یعنی بغیر فرشتہ کے واسطہ کے۔ تیسری قسم کی وحی فرشتے کے ذریعے سے ہے اور قرآن مجید سے جس بات کی طرف زیادہ راہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحی ہے بواسطہ ''مَلَک''۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ.....﴾ (الشعراء) ''اسے لے کر آپ کے دل پر روحِ امین اترا ہے.....'' اور: ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (البقرۃ:۹۷) ''پس اسے جبریل

نے ہی آپ کے قلب پر نازل کیا ہے۔'' البتہ فرشتے کے بغیر وحی' یعنی دل میں کسی بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ڈال دیا جانا' یعنی ''الہام'' کا ذکر بھی حضور ﷺ نے کیا ہے اور اس کے لئے حدیث میں ''نَفَثَ فِی الرَّوعِ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی کسی نے دل میں کوئی بات ڈال دی' کسی نے پھونک ماردی بغیر اِس کے کہ کوئی آواز سننے میں آئی ہو۔ ایک کیفیت صلصلۃ الجرس کی بھی تھی۔ حضور کو گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی اور اس کے بعد حضور ﷺ کے قلبِ مبارک پر وحی نازل ہو جاتی تھی۔

بہر حال تیقّن کے ساتھ تو مَیں نہیں کہہ سکتا' لیکن میرا گمان غالب ہے کہ تیسری قسم کی وحی (بذریعۂ فرشتہ) پر پورے کا پورا قرآن مشتمل ہے۔ اور وحی براہِ راست یعنی ''القاء'' تو درحقیقت وحی خفی ہے' جس کی وضاحت انگریزی کے دو الفاظ کے درمیان فرق سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ ہے inspiration اور دوسرا revelation' جس کے ساتھ ایک اور لفظ verbal revelation بھی اہم ہے۔ inspiration میں ایک مفہوم' ایک خیال یا تصور انسان کے ذہن وقلب میں آ جاتا ہے' جب کہ revelation باقاعدہ کسی چیز کے کسی پر reveal کئے جانے کو کہتے ہیں۔ اور اس میں بھی عیسائیوں کے ہاں ایک بڑی بحث چل رہی ہے۔ وہ revelation کو مانتے ہیں لیکن verbal revelation کو نہیں مانتے' بلکہ ان کے نزدیک صرف مفہوم ہی انبیاء کے قلوب پر نازل کیا جاتا تھا' جسے وہ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس بارے میں مستقل اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہ لفظاً بھی وحی ہے اور معناً بھی' لفظاً بھی اللہ کا کلام ہے اور معناً بھی' یعنی یہ verbal revelation ہے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ لاہور ہی میں غالباً ایف سی کالج کے پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا تھا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ ان صاحب نے علامہ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ verbal revelation کے قائل ہیں! اس پر علامہ نے اس وقت جو جواب دیا وہ اُن کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں

نے کہا کہ جی ہاں' میں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں' بلکہ مجھے تو اس کا تجربہ ہے۔ چنانچہ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ کے جامے میں ڈھلے ہوئے آتے ہیں' میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا' معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ مجھ پر نازل کئے جاتے ہیں۔ تو یہ درحقیقت کسی کو جواب دینے کا وہ انداز ہے جس کو عربی میں "الاجوبة المُسكتة" یعنی چپ کرا دینے والا جواب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جواب ہے جس کے بعد فریق ثانی کے لئے کسی قیل وقال کا موقع ہی نہیں رہتا۔

بہرحال کلام الٰہی واقعتاً verbal revelation ہے جس نے اوّلاً قولِ جبرائیل کی شکل اختیار کی۔ حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے قول کی شکل میں نازل ہوا۔ اور پھر زبانِ محمدی سے قولِ محمدی کی شکل میں ادا ہوا۔ تو یہ درحقیقت revelation ہے' inspiration نہیں' اور محض revelation بھی نہیں بلکہ verbal revelation ہے' یعنی معانی' مفہوم اور الفاظ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی اللہ کا کلام ہے۔

(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول

قرآن مجید کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ضمن میں بھی چند باتیں نوٹ کر لیں۔ پہلی بحث تو ''نزول'' کی لغوی بحث سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نَزَلَ' یَنْزِلُ ثلاثی مجرد میں بھی آتا ہے۔ تب یہ فعل لازم ہوتا ہے' یعنی ''خود اترنا''۔ قرآن مجید کے لئے ان معنوں میں یہ لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۵) ''ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے''۔ یہاں یہ فعل لازم آ رہا ہے' یعنی نازل ہوا۔ عام طور پر فعل لازم کو متعدی بنانے کے لئے اس فعل کے ساتھ کسی صلہ (preposition) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فعل نَزَلَ ''بِ'' کے ساتھ متعدی ہو کر بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ بمعنیٰ اُس نے اتارا' جیسے جَاءَ ''وہ آیا'' سے جَاءَ بِهٖ ''وہ لایا''۔ مثلاً: ﴿نَزَلَ

بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِکَ......﴾ (الشعراء) یعنی رُوح الامین (جبرائیل) نے اس قرآن کو اتارا ہے محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیتیں: اِنزال اور تنزیل

ثلاثی مزید فیہ کے دو ابواب یعنی بابِ افعال اور باب تفعیل سے یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں ابواب سے یہ فعل متعدی کے طور پر بمعنی ''اتارنا'' استعمال ہوتا ہے' یعنی اَنْزَلَ' یُنْزِلُ' اِنْزَالاً اور نَزَّلَ' یُنَزِّلُ' تَنْزِیْلاً۔ ان دونوں کے مابین فرق یہ ہے کہ بابِ افعال میں کوئی فعل دفعۃً اور یک دم کر دینے کے معنی ہوتے ہیں جبکہ باب تفعیل میں وہی فعل تدریجاً' اہتمام' توجہ اور محنت کے ساتھ کرنے کے معنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین فرق کو ''اعلام'' اور ''تعلیم'' کے معنی کے فرق کے حوالے سے بہت ہی نمایاں طور پر اور جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ ''اعلام'' کے معنی ہیں بتا دینا۔ یعنی آپ نے کوئی چیز پوچھی تو جواب دے دیا گیا۔ چنانچہ ''Information Office'' یا ''Inquiry Office'' کو عربی میں ''مکتب الاعلام'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ ''تعلیم'' کے معنی ذہن نشین کرانا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا ہے۔ یعنی پہلے ایک بات سمجھا دینا' پھر دوسری بات اس کے بعد بتانا اور اس طرح درجہ بدرجہ مخاطب کے فہم کی سطح بلند سے بلند تر کرنا۔

اگرچہ قرآن مجید کے لئے لفظ ''اِنْزَال'' اور اس سے مشتق مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن بکثرت لفظ ''تنزیل'' استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی اصل شان تنزیلی شان ہے' یعنی یہ کہ اس کو تدریجاً' رفتہ رفتہ' تھوڑا تھوڑا اور نجماً نجماً نازل کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے حضور ﷺ پر نزول کے لئے صحیح تر اور زیادہ مستعمل لفظ قرآن حکیم میں تنزیل ہے' تاہم دو مقامات پر لَیْلَۃُ الْقَدْرِ اور لَیْلَۃٌ مُّبٰرَکَۃٌ کے ساتھ انزال کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾﴾ (القدر) اور: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ﴾ (الدخان:۳) اسی طرح ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) میں بھی لفظ ''انزال'' استعمال ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ پر نزول

کے لئے بھی کہیں کہیں لفظ ''انزال'' آیا ہے' اگرچہ اکثر و بیشتر لفظ ''تنزیل'' ہی آیا ہے۔ اس کی تقریباً مجمع علیہ تاویل یہ ہے کہ پورا قرآن دفعۃً لوح محفوظ سے سمائے دنیا تک لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا' جسے ''لیلۃ مبارکہ'' بھی کہا گیا ہے جو کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔ لہٰذا جب رمضان مبارک کی لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا ذکر ہوا تو لفظ انزال استعمال ہوا۔ قرآن مجید سمائے دنیا پر ایک ہی بار مکمل پور طور پر نازل ہونے کے بعد وہاں سے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کر کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ لہٰذا حضور ﷺ پر نزول کے لئے اکثر و بیشتر لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے۔

لفظ تنزیل کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ نہایت اہم ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

توراۃ تختیوں پر لکھی ہوئی' مکتوب شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ وہ چونکہ دفعۃً اور جملۃً واحدۃً دے دی گئی' اس لئے اِس کے لئے لفظ انزال آیا ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت میں ''تنزیل'' اور ''انزال'' ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آئے ہیں۔ گویا یہاں ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِهَا'' (چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول درست بیٹھتا ہے۔

حکمتِ تنزیل:

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنزیل کی حکمت کیا ہے؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا اور ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ قرآن مجید میں اس کی دو حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگ شاید اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ چنانچہ لوگوں کے تحمل کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تا کہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھیں' اس پر غور کریں اور اسے حرزِ جان بنائیں اور اسی کے مطابق ان کے ذہن وفکر کی سطح بلند ہو۔ یہ حکمت سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴾

''اور ہم نے قرآن کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تا کہ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کو سناتے رہیں اور ہم نے اسے بتدریج اتارا۔''

اس حکمت کو سمجھنے کے لئے بارش کی مثال ملاحظہ کیجئے۔ بارش اگر ایک دم بہت موسلا دھار ہو تو اس میں وہ برکات نہیں ہوتیں جو تھوڑی تھوڑی اور تدریجاً ہونے والی بارش میں ہوتی ہیں۔ بارش اگر تدریجاً ہو تو زمین کے اندر جذب ہوتی چلی جائے گی' لیکن اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ بہتا چلا جائے گا۔ یہی معاملہ قرآن مجید کے انزال وتنزیل کا ہے۔ یہ لوگوں کی مصلحت ہے کہ قرآن ان کے فہم میں' ان کے باطن میں' ان کی شخصیتوں میں تدریجاً سرایت کرتا چلا جائے۔ سرایت کے حوالے سے مجھے پھر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

''(یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لئے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!''

تو جب یہ قرآن کسی کے اندر اس طرح اتر جاتا ہے جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے سرایت کرنے کے لئے اس کا تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا ہی حکمت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات سورۃ الفرقان میں کہی گئی ہے' اس لئے کہ وہاں کفارِ مکہ بالخصوص سردارانِ قریش کا باقاعدہ ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝﴾

''منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ —— ہاں' ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کو ہم اچھی طرح آپ کے ذہن نشین کرتے رہیں اور اس کو ہم نے بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے' اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے آپ کو دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔''

اعتراض یہ تھا کہ یہ پورا قرآن یک دم' یک بارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ اس اعتراض میں جو وزن تھا' پہلے اس کو سمجھ لیجئے۔ انہوں نے جو بات کی درحقیقت اس سے مراد یہ تھی کہ جیسے ہمارا ایک شاعر دفعۃً پورا دیوان لوگوں کو فراہم نہیں کر دیتا' بلکہ وہ ایک غزل کہتا ہے' قصیدہ کہتا ہے' پھر مزید محنت کرتا ہے' پھر کچھ اور طبع آزمائی کرتا ہے' پھر کچھ اور کہتا ہے' اس طرح تدریجاً دیوان بن جاتا ہے' اسی طریقے سے محمد (ﷺ) کر رہے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو پورے کا پورا ایک دم نازل ہو سکتا تھا۔ یہ تو درحقیقت انسان کی کیفیت ہے کہ پوری کتاب دفعۃً produce نہیں کر دیتا۔ پورا دیوان تو کسی شاعر نے ایک دن کے اندر نہیں کہا بلکہ اسے وقت لگتا ہے' وہ مسلسل محنت کرتا ہے' کچھ تکلف بھی کرتا ہے' کبھی آمد بھی ہو جاتی ہے' لیکن وہ کلام دیوان کی شکل میں تدریجاً مدوّن ہوتا ہے۔ تو یہ تو اسی طرح کی چیز ہے۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ ''کیوں نہیں یہ قرآن اس پر یک دم نازل ہو گیا؟''

اب اس کا جواب دیا گیا: ﴿كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ ''یہ اس لئے کیا ہے تاکہ اے نبیؐ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو تثبیت (جماؤ) عطا کریں۔'' یعنی وہ بات جو عام انسانوں کی مصلحت میں ہے وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی مصلحت پر مبنی ہے کہ آپ کے لئے بھی شاید قرآن مجید کا یک بارگی تحمل کرنا مشکل ہو

جاتا۔ سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اگر ہم پورے کے پورے قرآن کو دفعۃً کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا''۔ (نوٹ کیجئے کہ یہاں لفظ ''انزال'' آیا ہے)۔ معلوم ہوا کہ قلب محمدیؐ کو جماؤ اور ٹھہراؤ عطا کرنے کے لئے اسے بتدریج نازل کیا گیا ہے۔ ﴿وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ ''اور ہم نے اس کو بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے''۔ ''رتل'' چھوٹے پیمانے کو، چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔

اگلی آیت میں جو ارشاد ہوا اس کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اے نبی! جو اعتراض بھی یہ ہم پر کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔ لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلسل کشاکش ہے جو آپ کے اور مشرکین عرب کے درمیان چل رہی ہے۔ آج وہ ایک بات کہتے ہیں، اگر اسی وقت اس کا جواب دیا جائے تو وہ درحقیقت آپ کی دعوت کے لئے موزوں ہے۔ اگر یہ سارے کا سارا کلامِ الٰہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو حالات کے ساتھ اس کی مطابقت اور ان کی طرف سے پیش ہونے والے اعتراضات کا بروقت جواب نہ ہوتا اور اس کے اندر جو اثر انداز ہونے کی کیفیت ہے وہ پھر حاصل نہ ہوتی۔ اس تدریج میں اپنی جگہ موزونیت ہے اور اس کی اپنی تاثیر ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کو تدریجاً نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول:

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نزول کے ضمن میں اب دو چھوٹی چھوٹی چیزیں اور نوٹ کر لیجئے۔ یہ صرف معلومات کے ضمن میں ہیں۔ اس کا زمانہ نزول کیا ہے؟ ہم جس حساب (سن عیسوی) سے بات کرنے کے عادی ہیں، اسی حساب سے ہمارے ذہن کا صغریٰ کبریٰ بنا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے نوٹ کر لیجئے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس پر مشتمل ہے۔ یہ ۲۳ برس قمری بنیں گے۔ ۴۰ عام الفیل سے شروع کریں تو ۱۲ سال قبل ہجرت اور ۱۱ ہجری سال مل کر ۲۳ سال قمری بنیں گے، جن

کے دوران یہ قرآن بطرزِ تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ ایک رائے ذرا کمزور سی ہے کہ قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ۲۳ برس نہیں بلکہ ۲۰ برس ہے۔ بعض روایات کے مطابق ابتداء میں حضور ﷺ کے ساتھ تین برس تک حضرت اسرافیل رہے ہیں اور انہوں نے کوئی تعلیم حضور ﷺ کو دی جسے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیا تعلیم تھی۔ بہر حال یہ قول اس اعتبار سے ضعیف قرار پاتا ہے کہ صحیح احادیث میں یہ شہادت موجود ہے کہ پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیات نازل ہوئیں' پھر تین سال کا وقفہ آیا۔ سورۃ العلق کی یہ پانچ آیات بھی چونکہ قرآن مجید کا حصہ ہیں' لہٰذا صحیح قول یہی ہے کہ قرآن حکیم کا زمانہ نزول ۲۳ قمری یا ۲۲ شمسی سال ہے۔

اب یہ کہ نزول کی جگہ کون سی ہے؟ اس ضمن میں صرف ایک لفظ نوٹ کر لیجئے کہ تقریباً پورے کا پورا قرآن ''حجاز'' میں نازل ہوا۔ اس لئے کہ آغازِ وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ کا کوئی سفر حجاز سے باہر ثابت نہیں ہے۔ آغازِ وحی سے قبل آپ نے متعدد سفر کئے ہیں۔ آپؐ شام کا سفر کرتے تھے' یقیناً یمن بھی آپؐ جاتے ہوں گے۔ اس لئے کہ الفاظِ قرآنی ''رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ'' کی رو سے قریش کے سالانہ دو سفر ہوتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شمال کی طرف جاتے تھے' اس لئے کہ فلسطین کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا ہے اور سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کی طرف (یمن) جاتے تھے' اس لئے کہ وہ گرم علاقہ ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تجارتی سفر کئے ہیں۔ بعض محققین نے تو یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ آپؐ نے اُس زمانے میں کوئی بحری سفر بھی کیا اور گلف کو عبور کر کے مکران کے ساحل پر کسی جگہ آپ تشریف لائے (واللہ اعلم!)۔ یہ بات میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر میں سنی تھی جو انہوں نے حیدر آباد (سندھ) میں دیا تھا' لیکن بعد میں اس پر جرح ہوئی کہ یہ بہت ہی کمزور قول ہے اور اس کے لئے کوئی سند موجود نہیں ہے۔ البتہ ''الخُبر'' جہاں آج آباد ہے وہاں پر تو ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا اور حضور ﷺ کا وہاں تک آنا ثابت ہے۔ بہر حال آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ آغازِ وحی کے بعد دس سال تک تو مکہ مکرمہ میں رہے' اس کے بعد طائف

کا سفر کیا ہے۔ پھر آس پاس ''عکاظ'' کا میلہ لگتا تھا اور منڈیاں لگتی تھیں' ان میں آپ نے سفر کئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی ہے۔ اس کے بعد سب جنگیں حجاز کے علاقے ہی میں ہوئیں' سوائے غزوۂ تبوک کے۔ لیکن تبوک بھی اصل میں حجاز ہی کا شمالی سرا ہے۔ اس اعتبار سے حجاز ہی کا علاقہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ تاہم دو آیتیں اس اعتبار سے مستثنیٰ قرار دی جا سکتی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو تین تحفے عطا کئے' ان میں نماز کی فرضیت اور دو آیاتِ قرآنی شامل ہیں۔ یہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات ہیں جو عرش کے دو خزانے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں عطا ہوئے۔ تو یہ دو آیتیں مستثنیٰ ہیں کہ یہ زمین پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ پر دی گئیں اور خود آپؐ ساتویں آسمان پر تھے' جبکہ پورا قرآن آسمان سے زمین پر نازل ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے حجاز کا علاقہ مہبط وحی ہے۔

(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے بارے میں تین بنیادی اور اعتقادی چیزیں ہیں: اوّل' یہ اللہ کا کلام ہے۔ دوم' یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ سوم' یہ من وعن کُل کا کُل محفوظ ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس میں کچھ اشتباہ اہل تشیع نے پیدا کیا ہے' لیکن ان کی بات بھی میں کچھ یقین کے ساتھ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ''ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں''۔ البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں' فلاں سورت حضرت علی ؓ کی مدح اور شان میں تھی' وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ' ان کے بارے میں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کالانعام کی باتیں ہیں یا ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کہ بہر حال اہل سنت

کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور کُل کا کُل من وعن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے لئے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سورۃ القیامۃ میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے از راہِ شفقت فرمایا کہ ''آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ آپؐ مشقت نہ جھیلیں' یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینہ مبارک کے اندر جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب قائم کر دیں گے' اس کو پڑھوا دیں گے۔ جس ترتیب سے یہ نازل ہو رہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجئے۔ اصل ترتیب جس میں اس کا مرتب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے' جو ترتیب لوحِ محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوا دیں گے۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ پھر اگر آپ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تدوین بھی ہمارے ذمہ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے' اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔ صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ع

حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

''اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔''

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: ا۔ قرآن کے حروف میں یعنی اس

کے متن میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ من وعن محفوظ ہے۔۲۔اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو' کہیں تبدیلی کی گئی ہو' قطعاً ایسا نہیں۔۳۔کیا اس کی آیات کی الٹ سلٹ تاویل بھی کی جاسکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے' اس لئے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجۂ استناد کو نہیں پہنچ سکی' اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہو سکا' قرآن نے خود اس کو رد کر دیا۔ جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے' ایسی تاویلات بھی اُمت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔ اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ حم السجدۃ کی آیت ۴۲ میں ہے: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝﴾ ''باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہو سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے''۔

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے' اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے' اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے ——— سورۃ الحاقۃ کی یہ آیات ملاحظہ کیجئے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝﴾

''(کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا) اگر یہ (ہمارے نبی محمد ﷺ) خود بھی (بفرضِ محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑیں گے اور ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔ پھر تم میں سے کوئی (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی و مددگار) نہیں ہوگا کہ جو انہیں ہماری پکڑ سے بچا سکے۔''

یہاں تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔ کفار و

مشرکین کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپ اس قرآن میں کچھ نرمی اور لچک دکھائیں' یہ تو بہت rigid ہے' بہت ہی uncompromising ہے' بہرحال دنیا میں معاملات ''کچھ لو کچھ دو'' (give and take) سے طے ہوتے ہیں' لہٰذا کچھ آپ نرم پڑیں کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝﴾ (القلم) ''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے''۔ اور سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

''جب انہیں ہماری آیاتِ بیّنات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجئے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجئے میرے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔''

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً' معناً' متناً کلی طور پر محفوظ ہے۔

(جاری ہے)

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 20 روپے اشاعت عام: 10 روپے

زیتون

تحقیق وتحریر: سیّد قاسم محمود

عربی: الزّیتون	عبرانی: زیت
اردو، فارسی، ہندی: زیتون	انگریزی: olive
لاطینی، روسی: oliva	ہسپانوی: olivo
جرمن: Elia	نباتاتی نام: Olea europaea Linn

قرآن مجید میں زیتون کا ذکر سات آیات میں آیا ہے۔

(۱) سورۃ الانعام کی آیت ۹۹:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات اُگائی، پھر اُس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کئے، پھر اُن سے تہہ بہ تہہ چڑھے ہوئے دانے نکالے، اور کھجور کے شگوفوں سے چھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کئے جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں، اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں، اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں۔ یہ درخت جب پھلتے ہیں تو اُن میں پھل آنے اور پھر اُن کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔''

(۲) اسی سورت میں آگے چل کر آیت ۱۴۱ میں دوبارہ زیتون کا ذکر آیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۪ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝﴾

''وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کئے' کھیتیاں اگائیں' جن سے قسم قسم کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں۔ زیتون اور انار کے درخت پیدا کئے' جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ اُن کی پیداوار' جبکہ یہ پھلیں' اور اللہ کا حق ادا کرو جب اُن کی فصل کاٹو' اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

(۳) سورۃ النحل کی آیت ۱۱ میں یوں آیا ہے:

﴿یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

''وہ اس پانی کے ذریعے سے کھیتیاں اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

(۴) سورۃ المؤمنون کی آیت ۲۰ میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے:

﴿وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِیْنَ ۝﴾

''اور وہ درخت بھی ہم نے پیدا کیا جو طورِ سینا سے نکلتا ہے' تیل بھی لئے ہوئے اُگتا ہے اور کھانے والوں کے لئے سالن بھی۔''

(۵) سورۃ النور' آیت ۳۵:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝﴾

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو' چراغ ایک فانوس میں ہو' فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا' اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو' جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو' خواہ اس کو آگ نہ لگے۔ (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں۔) اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے' رہنمائی فرماتا ہے' وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

(۶) سورۃ عبس' آیت ۲۹:

﴿وَزَيْتُونًا وَّنَخْلًا ۝﴾

''اور زیتون اور کھجوریں (اُگائیں)۔''

(۷) سورۃ التین کی پہلی آیت میں تو زیتون کی قسم کھائی گئی ہے:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝﴾ ''قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔''

ان آیات میں غور طلب نکات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زیتون کے درخت کو ایک مبارک یعنی برکت والا درخت قرار دیا ہے۔ اس کے پھل کو اہمیت و افادیت عطا فرمائی۔ پھر لوگوں کو متوجہ کیا کہ زیتون' کھجور' انار اور انگور میں فوائد کے خزانے بھرے پڑے ہیں' بشرطیکہ تم ان کے فوائد سمجھنے کی کوشش کرو۔ سورۃ الانعام میں فرمایا گیا کہ آسمان سے پانی برستا ہے جس میں پینے کے ساتھ ساتھ مویشیوں اور کھیتی باڑی کے لئے اہمیت ہے۔ اہمیت کے سلسلے میں زیتون کا ذکر آیا اور زیتون کے ساتھ دوسرے مفید پھل بھی مذکور ہوئے۔ کھجور' انگور اور انار خوش ذائقہ پھل ہیں' مگر زیتون کا ذائقہ ایسا خوشگوار نہیں کہ کھانے کی رغبت محسوس ہو۔ چنانچہ زیتون کی افادیت و اہمیت جتانے کے لئے بار بار اس کا ذکر کیا گیا۔ یعنی بتایا گیا کہ یہ پھل ذائقے کے لئے نہیں' فائدے کے لئے ہے۔

قرآن مجید نے زیتون کی خاص افادیت و اہمیت کے باعث اس کا بار بار ذکر فرمایا۔ جہاں کسی اچھی نباتات یا فصل کا تذکرہ ہوا' زیتون کی مثال ضرور دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں اپنے نور کی وضاحت کے لئے زیتون' اُس کے تیل اور اس کی روشنی کی مثال دی۔ پھر فرمایا کہ یہ ایک مبارک درخت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس درخت کو اتنی اہمیت عطا فرمائی ہے تو رسول کریم ﷺ نے بھی اس کی اہمیت کے اسباب کی تشریح فرمائی ہے۔

حضرت اُسید الانصاری ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''زیتون کا تیل کھاؤ اور اس سے جسم کی مالش کرو' یہ ایک مبارک درخت سے ہے۔'' (ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

یہی روایت حضرت ابوسعید الخدری ﷺ سے اور مستدرک الحاکم میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے بھی منقول ہے۔

حضرت علقمہ بن عامر ﷺ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تمہارے لئے زیتون کا تیل موجود ہے۔ اسے کھاؤ اور جسم پر مالش کرو' کیونکہ یہ بواسیر میں فائدہ دیتا ہے۔'' (ابن جوزی)

خالد بن سعد روایت کرتے ہیں کہ میں غالب بن ابجر کے ہمراہ مدینہ آیا۔ راستے میں غالب بیمار ہو گئے۔ ان کی عیادت کو ابن ابی عتیق آئے اور بتایا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کلونجی میں شفا بتائی ہے۔ ہم نے کلونجی کے چند دانے کوٹ کر زیتون کے تیل میں ملا کر ناک کی دونوں اطراف میں ٹپکائے۔ ہم نے ایسا کیا تو غالب بن ابجر شفایاب ہو گئے۔ (بخاری' ابن ماجہ)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''زیتون کا تیل کھاؤ اور اسے جسم پر لگاؤ کہ اس میں ستر بیماریوں سے شفا ہے' جن میں سے ایک کوڑھ بھی ہے۔'' (ابونعیم)

مفسرین کی تحقیقات کے مطابق زیتون کا درخت تاریخ کا قدیم ترین پودا ہے۔ طوفانِ نوح علیہ السلام کے اختتام پر پانی اترنے کے بعد زمین پر جو سب سے پہلی چیز نمایاں ہوئی' وہ زیتون کا درخت تھا۔ اس درخت کے بابرکت ہونے کے باعث ہی یہ موجودہ زمانے میں بھی امن اور سلامتی کی علامت ہے۔ فلسطین کے رہنما یاسر عرفات مرحوم نے جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا تو اس کا آغاز اس جملے سے کیا: ''میں زیتون کی ڈالی لے کر آپ کے پاس آیا ہوں''۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ یاسر عرفات اقوامِ عالم کے لئے امن اور سلامتی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

فراعنۂ مصر کے قدیم مقبروں سے برآمد ہونے والی اشیاء میں زیتون کے تیل سے بھرے ہوئے برتن بھی شامل ہیں۔ زیتون کے تیل کا ذکر توریت میں بھی ہے۔

زیتون کا درخت تقریباً تین میٹر اونچا ہوتا ہے۔ چمکدار پتوں کے علاوہ اس میں بیر کی

شکل کا ایک پھل لگتا ہے' جس کا رنگ اُودا اور جامنی ہوتا ہے۔ ذائقہ کسیلا ہوتا ہے۔ یہ درخت بنیادی طور پر ایشیائے کوچک' فلسطین' بحیرۂ روم کے خطے' یونان' پرتگال' سپین' ترکی' اٹلی' شمالی افریقہ میں الجزائر اور تیونس' امریکہ میں کیلی فورنیا' میکسیکو' پیرو اور آسٹریلیا کے جنوبی علاقے میں پایا جاتا ہے۔ زیتون کا تیل بطور صنعت اور برآمد' فرانس' اٹلی' سپین' ترکی' الجزائر' تیونس اور یونان سے آتا ہے۔

زیتون کا پھل غذائیت سے بھرپور ہے' مگر اپنے کسیلے ذائقے کی وجہ سے بطور پھل زیادہ مقبول نہیں۔ اس کے باوجود مشرقِ وسطیٰ' اٹلی' یونان اور ترکی میں بہت لوگ یہ پھل خالص صورت میں کھاتے ہیں۔ یورپ میں اس کا اچار بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ یونان سے زیتون کا اچار سرکے میں آتا ہے۔ سعودی عرب کے پہلے فرمانروا عبدالعزیز ابن سعود کا ناشتہ کھجور' اونٹنی کے دودھ اور پنیر' اور زیتون پر مشتمل ہوتا تھا۔ زیتون کی شہرت اس کے پھل کی وجہ سے نہیں' بلکہ اس کے تیل کی وجہ سے ہے۔ ڈبوں میں بند ہونے والی سارڈین اور دوسری مچھلیاں محفوظ رکھنے کے لئے زیتون کے تیل میں رکھ کر پیک کی جاتی ہیں۔ اس تیل کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ بوتل خواہ کھلی بھی رہے' اس پر چیونٹیاں نہیں آتیں' اور جب اسے دیئے میں جلایا جائے تو یہ روشنی تو دیتا ہے' لیکن دوسرے تیلوں کی طرح دھواں نہیں دیتا۔

ابن القیمؒ اپنی تالیف ''طبِ نبویؐ'' میں زیتون کے تیل کے دوائی فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں: ''سرخ زیتون کا تیل سیاہی مائل سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ طبیعت بحال کرتا ہے۔ چہرے کا رنگ نکھارتا ہے۔ زہروں کے خلاف تحفظ دیتا ہے۔ معدے کے فعل کو اعتدال پر لاتا ہے۔ پیٹ کے کیڑے خارج کرتا ہے۔ بالوں کو چمکاتا اور بڑھاپے کی تکالیف اور اثرات کو کم کرتا ہے۔ زیتون کے تیل میں نمک ملا کر اگر مسوڑھوں پر ملا جائے تو ان کو تقویت دیتا ہے۔ یہی نمکین مرکب آگ سے جلے ہوئے کے لئے مفید ہے۔ تیل لگانے سے پھوڑوں' پھنسیوں' پتّی اور خارش میں فائدہ ہوتا ہے۔ وہ پھوڑے جن سے بدبو آتی ہو یا پرانی سوزش کی وجہ سے ٹھیک ہونے میں نہ آتے ہوں' زیتون کے تیل سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ زیتون کے تیل کی مالش کرنے سے اعضاء کو قوت حاصل ہوتی ہے' پٹھوں کا درد جاتا رہتا ہے۔ بعض طبیب اس کی مالش کو مرگی کے لئے بھی مفید قرار دیتے ہیں۔ وجع المفاصل اور عرق النساء کو دور کرتا ہے۔ چہرے کو بشاشت دیتا ہے۔ اسے مرہم میں شامل کرنے سے زخم جلد بھر جاتے ہیں۔ ناسور کو مندمل کرنے میں کوئی دوائی زیتون سے بہتر نہیں۔

قرآن کا پیغام

بارہ اسباق میں

تحریر: نعیم صدیقی

قرآن ناآشنا آدمی کا رویہ زندگی کے شہر میں کچھ اس طرح کا ہوتا ہے جیسے کوئی نادان دیہاتی کسی بڑے شہر میں جا پہنچے۔ وہ حیرت زدہ اور مبہوت بھی ہو' سر پھرا اور غلط جسارتوں کا مرتکب بھی۔ کبھی وہ آوارگی کرتا پھرتا ہے' کبھی من مانے طریقے سے تفریح کرتا ہے یا لاابالی پن سے انسانوں اور عمارتوں پر نظر ڈالتا ہے۔ کبھی دنگے فساد پر اتر آتا ہے تو کبھی خواتین سے بدتمیزی کر گزرتا ہے۔ کبھی اداروں' دفتروں اور عمارتوں میں غلط طور پر جا گھستا ہے۔ کبھی ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ کبھی آنکھیں بند کر کے بھاگتا ہوا سڑک پار کرتا ہے۔ غرض قدم قدم پر اپنے اور دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ بسا اوقات پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ کبھی عدالت میں لے جایا جاتا ہے۔ کبھی جیل کی ہوا بھی کھاتا ہے اور پھر کسی ناخوشگوار تجربے کے بعد بے بسی کے عالم میں بیٹھ کر زار زار رونے لگتا ہے' مگر وہ سمجھ نہیں پاتا یہ سب کچھ کیا ہے' یہ کیوں ہے!

فرض کیجئے اسی طرح کے کسی نادان نووارد کو آپ کسی جگہ پریشان وخستہ حال دیکھتے ہیں یا کسی سڑک پر' کسی پارک میں بے بسی سے روتا پاتے ہیں۔ آپ اس کے قریب چلے جاتے ہیں' ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی درد بھری کتھا سنتے ہیں۔ پھر اسے پیار سے سمجھاتے ہیں: عزیز من! اس شہر کی ایک حکومت ہے' اس کا ایک انتظام ہے۔ اس شہر میں رہنے اور اس کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کی پارکوں' عمارتوں اور گاڑیوں کو استعمال کرنے کے کچھ ضابطے ہیں۔ یہاں کے انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے اور تعلق رکھنے کے کچھ آداب مقرر ہیں' ان کو اگر نہیں جانو گے اور ان کا اگر لحاظ نہیں رکھو گے تو بار بار اذیت اور نقصان اٹھاؤ گے۔ ان کو سمجھ لو اور قبول کر لو تو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ لو میں تمہیں بتاؤں کہ یہاں حکومت کس

کی ہے۔ یہاں کے قوانین اور آداب کیا ہیں اور یہاں کا اخلاقی آئین کیا ہے۔
کچھ ایسا ہی ہمدردانہ اور خیر خواہانہ معاملہ ہے جو قرآن غم زدہ' پریشان حال اور آوارہ خیال انسان سے کرتا ہے۔

(۱)

قرآن کا بنیادی اور ابتدائی پیغام یا سبق اوّل انسان کے لئے یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں تم اتار دیئے گئے ہو' یہ اندھی نگری نہیں ہے جس کا نہ کوئی راجہ ہو' نہ جس میں کوئی قانون وضابطہ رائج ہو۔ یہاں تم شتر بے مہار بن کر کبھی امن وسکون نہیں پا سکتے۔ یہاں مادر پدر آزادی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کائنات کسی کھلنڈرے بچے کا بنایا ہوا گھروندا نہیں ہے۔ زندگی رام لیلا کی طرز کا کوئی ناٹک نہیں ہے۔ بے مقصد بھول بھلیاں بھی نہیں۔ یہ سلسلۂ حوادث ایک حیرت خانۂ امروز وفردا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے۔ غرض تمہیں یونہی دل لگی کے لئے نیست سے ہست نہیں کر دیا گیا۔ تمہارے وجود اور زندگی دونوں کے لئے بڑی بھاری ذمہ داریاں ہیں:

﴿..... وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ (آل عمران:۱۹۱)

''وہ لوگ زمین وآسمان (کے نظام) کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں (اور پھر پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔''

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا .....﴾ (المؤمنون:۱۱۵)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کر دیا ہے؟''

(۲)

قرآن سلطنت الٰہی کے انجان شہری کو کچھ اور باتیں بتاتا ہے اور وہ کہتا ہے اس چمن میں پھول ہی پھول نہیں ہیں' کانٹے بھی ہیں۔ یہاں نسیم سحری ہی نہیں چلتی' صرصر وسموم بھی چلتی ہے۔ یہاں نشیمن ہی نہیں' دام اور قفس بھی ہیں۔ یہاں خرمن ہی نہیں ہوتے' بجلیاں بھی گرتی ہیں۔ یہاں خیر کے ساتھ ساتھ شر بھی پایا جاتا ہے اور راحتوں کے ساتھ دکھ بھی۔ یہاں زندگی اپنے کرشمے دکھاتی ہے اور موت اپنا پارٹ ادا کرتی ہے۔ یہاں انسان اضداد کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

یہاں ہر اقدام لازماً اچھی ہی سمت میں نہیں ہوتا' بلکہ بہت سی جادہ پیمائیاں منزل مقصود سے دور تر بھی لے جاتی ہیں۔ یہاں رہنما اور رہزن ایسے گھلے ملے ہیں کہ آدمی کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ کس کا ساتھ دے۔ یہاں ہر قدم پر ایک دوراہا سامنے آتا ہے اور آدمی کو فوری فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کدھر جائے۔

حق وراستی کی طرف لے جانے والے محرکاتِ خیر بھی ہیں اور محرکاتِ شر بھی' جن کے اثر سے بے شمار افراد بلندی کی طرف بھی جاتے ہیں اور بے شمار لوگ پستی کی طرف بھی لڑھکتے ہیں۔ اسی طرح اقوام ترقی بھی کرتی ہیں اور تباہ بھی ہوتی ہیں۔ دیکھو کتنے عالیشان تمدنوں کے مزار چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں!

﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا﴾ (یونس:۱۳)

''اور تم سے پہلے کی قوموں کو (جو اپنے زمانے میں برسرعروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی۔''

وہ بتاتا ہے کہ یہ دنیا کوئی چھوٹ کی دنیا نہیں ہے۔ یہ لاوارثا گھر نہیں ہے۔ یہاں کوئی خوان یغما بچھا ہوا نہیں ہے' بلکہ یہ کسی کی ملکیت ہے جس کے قوانین گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ جہاں تم نے غلط قدم اٹھایا کوئی نہ کوئی قانون تمہیں گھیر لے گا' ایک نادیدہ قانونی طاقت تمہارا احاطہ کر لے گی اور تم اس کی پکڑ سے باہر نہ جا سکو گے۔

پھر جیسے آپ اپنے شہر کے نووارد کو بتاتے ہیں کہ میاں یہاں ذرا چوکنا رہ کے چلو پھرو' یہاں جیب کترے اور ٹھگ' اٹھائی گیرے بھی ہیں جو بھنگ یا نشہ آور مٹھائی کھلا کر نووارد وں پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں' اسی طرح قرآن انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ یہاں ابلیس اور اس کا لشکر جن میں شیاطینِ انس بھی شامل ہیں' پھیلا ہوا ہے جو ہر بدی کو خوشنما اور رنگین و دلفریب بنا کر پیش کرتا ہے اور پھر چکا کر' بہلا پھسلا کر تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن انتباہ کرتا ہے کہ:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (البقرۃ)

''شیطان کی پیروی نہ کرو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یہ شیاطین بسا اوقات دوست اور ناصح بن کر آتے ہیں۔ بڑے خیر خواہانہ مشورے دیتے ہیں' امیدیں دلاتے ہیں' پراسرار طریق سے اپنی بات القا کرتے ہیں' بدترین معصیت کو رومان اور لذت اور تفریح اور رنگینی سے آراستہ کر کے لاتے ہیں' بدترین مفاسد کو حکمت و فلسفہ کے مرعوب کن پیرایہ میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں' اور پھر جب ان کا شکار تباہی سے

دو چار ہوتا ہے تو اسے دھتکار کر کہتے ہیں کہ اب اپنی حماقت کا نتیجہ مزے سے بھگتو۔ شیاطین کے سربراہ کا یہ چیلنج بھی ملاحظہ ہو:

﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ﴾(الاعراف:۱۷)

''پھر میں ان (ابنائے آدم) کو آگے سے' پیچھے سے' دائیں سے اور بائیں سے گھیروں گا۔''

قرآن کے خیر خواہانہ انتباہات سے ایک سلیم الفطرت آدمی یہ حقیقت پالیتا ہے کہ زندگی گزارنا کوئی کھیل نہیں ہے' یہاں تو ایک پُرخطر جنگل میں سے راستہ نکالنا ہے' اور جو مختلف راستے نکلتے ہیں اور ان کی طرف مختلف بلانے والے بلاتے ہیں' ان میں سے صحیح راستے کی شناخت کرنی ہے جو انسانی ارتقاء کی آخری منازل تک لے جاسکے۔

(۳)

قرآن کے اس دوسرے سبق کے تقاضے سے تیسرا سبق ابھرتا ہے اور ایک بیدار دل آدمی کا ذہن خود بخود ادھر منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا بچ بچا کر چلنے کی جگہ ہے' یہاں پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہئے۔ یہاں ہر مقام پر یہ طے کرنا ضروری ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے!

مدعا یہ کہ صحیح زندگی جبھی مل سکتی ہے جبکہ اس کے ساتھ تمیز خیر و شر کی کم از کم سنجیدہ کوشش پائی جائے۔ جو زندگی تمیز خیر و شر کی کوشش سے خالی ہو وہ فلاح سے خالی رہے گی اور کبھی اچھے نتائج تک نہیں پہنچے گی۔

(۴)

قرآن شہر زندگی کے پریشان خیال نو وارد کو یہ احساس دلاتا ہے کہ دنیا کی گزرگاہ سے گزرنے والے مسافر کے لئے غفلت کے ساتھ اور عبرت سے بے نیاز ہو کر چلنا درست نہیں ہے' بلکہ بیدار عقل' متحرک ذہن' کھلے کانوں اور دیکھتی آنکھوں کے ساتھ ہی یہ وادی بخیر و خوبی پار کی جاسکتی ہے۔ اس کی نگاہ میں وہ لوگ فریضۂ زندگی کو ادا کرنے میں بالکل ناکارہ ہیں جو صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ (بہرے' گونگے اور اندھے) کی تعریف میں داخل ہیں۔ اور سنئے:

﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الانفال)

''یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے

کام نہیں لیتے۔''

دوسری جگہ وہ اس ناکارہ عنصر کا تذکرہ یوں کرتا ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ (الاعراف)

''اُن لوگوں کے دل (ودماغ) ہیں مگر یہ اُن سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر یہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے کان ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں' بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔''

وہ انسانوں کو تفکر اور تدبر کا درس دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کائنات اور زندگی کی حقیقتوں کے متعلق آدمی کے دل میں سوالات پیدا ہوں' وہ اپنی حقیقت کے جاننے کے درپے ہو' وہ اپنا صحیح مقام دنیا میں متعین کرے کہ وہ کہاں کھڑا ہے' اس کا مرتبہ کیا ہے' اس کا کس سے کیا تعلق ہے اور اُسے یہاں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن جو لوگ ان بنیادی مسائل کے بارے میں کبھی کاوش ہی میں نہ پڑیں' کبھی ان کے دلوں میں کوئی سوال ہی زندگی کی حقیقت کے بارے میں پیدا نہ ہو' بلکہ کھانے' کمانے' گھر بسانے' جنسی تسکین کے درپے رہیں' انہیں قرآن بہرے' گونگے اور اندھے قرار دیتا ہے۔

(۵)

عقل سے کام لے کر مطالعہ کائنات وحیات کا مشورہ دے کر قرآن پیچھے نہیں ہٹ جاتا' بلکہ شہر زندگی کے مسافر کو ایک گائیڈ کی طرح اپنے ساتھ گھماتا ہے اور ایک ایک کر کے آیاتِ حقیقت کو اس کے سامنے کھولتا ہے۔

وہ مونس و ہمدم بن کر اُس سے کہتا ہے کہ آؤ تمہارے ساتھ ہو کر تمہیں کچھ دکھاؤں۔ پیارے انسان! یہ دیکھتے ہو کہ سورج کس باقاعدگی سے مشرق سے نکل کر مغرب میں ہر روز ڈوبتا ہے۔ اور چاند تاروں کی گردش دیکھو' دن اور رات کا ادل بدل دیکھو' موسموں کے چرخے کا گھماؤ دیکھو۔ یہ مقررہ ڈھنگ سے چلنے والی ہوائیں' یہ ہواؤں کے دوش پر لد کر آنے والے بادل اور پھر بادلوں کا کثیف بن جانا' یہ مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا' یہ ننھے منھے بیجوں کا پھوٹنا' یہ نشوونما پاتی فصلیں' یہ ہرے بھرے کھیت' یہ طرح طرح کے درخت' ان پر لگنے والے

مختلف رنگوں اور ذائقوں کے پھل' یہ زمین پر بنے ہوئے راستے اور ان کو نمایاں کرنے والے نشانات' یہ سمندروں پر تیرتی ہوئی کشتیاں' یہ پہاڑ جیسی اٹھتی موجیں' یہ کشتیوں اور طوفانوں کی کشاکش میں انسانی زندگی کا ڈانوا ڈول ہونا' خود انسان کا اپنے نظامِ ولادت و پرورش' انسانوں کی شکلوں اور رنگوں اور بولیوں کا تفاوت' یہ تمہارے سامنے پھیلی ہوئی کتابِ حقیقت کی روشن آیات ہیں۔ ان میں تم تین باتیں نمایاں دیکھتے ہو۔ ایک نظم و ترتیب' دوسرے توافق اور تیسرے حسن و جمال۔ اور وہ دریافت کرتا ہے:

﴿مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝﴾ (الملك)

''تو خدا کی پیدائش وصفتِ خلق میں کوئی نقص و کوتاہی نہ پائے گا۔ ایک بار ذرا نگاہ ڈال' کیا اس نظام میں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟''

قرآن اپنے شاگرد کو پھر توجہ دلاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں قانون کی پابند ہیں اور ایک اقتدار میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اتنے بھاری بھاری اجرام اور عالم طبعی کی طوفانی طاقتوں کو ضوابط کی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے اور وہ قوتِ برتر کے سامنے مطیع و منقاد اور مسلم عاجز بنی ہوئی ہیں۔

﴿وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا...﴾(آل عمران:۸۳)

''اور آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں۔''

اس استدلال کے راستے قرآن آدمی کو ساتھ لئے اس شعور تک پہنچاتا ہے کہ نظم و ترتیب اور توازن و توافق اور قانون و ضابطہ اور حسن و جمال کے ساتھ چلنے والی اس دنیا میں جہاں پتہ پتہ' قطرہ قطرہ اور ذرّہ ذرّہ (اور آج کی معلومات کے مطابق ایٹم کا ایک ایک برقیہ) ایک بندش میں جکڑا ہوا ہے' خود تم بھی نہ تو عملاً آزاد ہو اور نہ آزادی کا استحقاق رکھتے ہو اور نہ ہی آزادی میں تمہارا بھلا ہے۔ یوں قرآن' شہر زندگی کے انجان نووارد کو گھماتے پھراتے اور یہاں کے احوال کا مشاہدہ کراتے کراتے اُس کے اندر غیر محسوس طور سے یہ احساس بیدار کر دیتا ہے کہ یہاں تمہارا مقام مالک اور حاکم مقتدر کا نہیں ہے' بلکہ محکومی اور عبودیت کا ہے' اور تمہاری خیر اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو ''مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ'' کی رضا کے حوالے کر دو۔

(۲)

قرآن متذکرہ بالا سارے ابتدائی اسباق میں' جن کا مقصد اصل سبق کے لئے مخاطب

اور قاری کو تیار کرتا ہے' درحقیقت ہدایت کی پیاس پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بعد میں ہدایت کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ وہ پہلے طلب پیدا کرتا ہے' پھر مطلوب کو سامنے لے آتا ہے۔ پہلے سوال ابھارتا ہے' پھر جواب فراہم کرتا ہے۔

قرآن اہل تدبر اور تفکر اور اصحابِ احتیاط وتقویٰ کو وہ اصل سبق دیتا ہے جس کے لئے بڑی تیاریاں ہیں اور بڑا اہتمام ہے۔

آیئے اس مرکزی سبق کو قرآن سے اخذ کریں۔ وہ مختصر سا سبق یہ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرة)

''اے انسانو! اپنے ربّ کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا شاید کہ تم (پوری طرح) تقویٰ کیش بن سکو۔''

یعنی غور وفکر کرنے والے (اولوالالباب) جب یہ حقیقت پالیں کہ یہاں نظم وتوافق ہے' مقصد وغایت ہے' حسن وجمال ہے' تو انہیں اس صداقت تک از خود پہنچنا چاہئے کہ یہ سارا سلسلۂ وجود حکیمانہ قوانین پر مبنی ہے اور قانون کا وجود یہ پتہ دیتا ہے کہ کوئی قانون ساز اور کارپرداز ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ وہ اللہ ہے' وہی تمہارا ربّ ہے' اور اس ربّ کے ساتھ تمہارے تعلق کی ایک ہی صورت عقلاً بھی درست ہے اور عملاً بھی صحیح ہے' کہ تم اس کے عبد بن کے رہو۔ مگر عبادت کسی جزوی صورت میں مراد نہیں' یہاں پوری زندگی کا مصرف بیان ہوا ہے۔ اس کائنات میں دو ہی بڑے مناصب ہیں۔ ایک ربّ اور معبود ہونے کا' دوسرا بندہ اور عبادت گزار ہونے کا۔ انسان بہرحال ربّ اور معبود نہیں ہے' اس کا منصب صرف دوسرا ہی منصب ہوسکتا ہے اور وہی ساری مخلوق کا مقام بھی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کسی بھی گوشے میں اور زمانہ کے کسی بھی حصے میں عبدیت کے مقام سے الگ نہیں ہوسکتا اور اس کے لئے کوئی امکان نہیں ہے کہ ربّ یا معبود کے مرتبے پر فائز ہو یا اس مرتبے میں ربّ کائنات کا حصہ دار ہوسکے۔

پوری زندگی کو خدا کی عبادت میں لگا دینا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کا دانشور شاگرد اپنے ربّ کے سامنے سرِتسلیم خم کردے' پوری طرح جھک جائے اور اس کے بالمقابل اپنی آزادی سے دستبردار ہوجائے۔ اس بارے میں قرآن کا سبق یہ ہے کہ:

﴿فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا﴾ (الحج: ٣٤)

''پس تمہارا الٰہ (معبود) ایک ہی الٰہ ہے' سو اسی کے آگے سرِتسلیم خم کرو۔''

اس مطلوب رویہ کی بہترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرزِ عمل سے لی گئی کہ:

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''اور جب اس کے ربّ نے کہا کہ (میرے سامنے) جھک جا تو اُس نے کہا میں ربّ العالمین کے سامنے جھکتا ہوں۔''

اس رویہ پر جو دینِ حق پر مبنی ہے' جو مسلکِ زندگی سے مطابقت رکھتا ہے' اس کا نام ہی ''اسلام'' (مسلک تسلیم) طے پایا۔ فرمایا کہ:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۱۹)

''یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔''

(۷)

لیکن یہ مسلکِ اسلام' یہ دینِ حق' یہ عبادتِ ربّ کوئی ایسی چیز نہیں کہ افراد اپنی حد تک اس کے کچھ تقاضے پورے کر کے فارغ ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ایک بڑا عظیم الشان فریضہ اور مشن ہے جو اُس کے ماننے والوں کو تفویض کیا گیا ہے۔

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۰٤)

''اور چاہئے کہ تم میں سے کچھ لوگوں پر مشتمل ایسا گروہ اٹھے جو (لوگوں کو) بھلائی کی طرف پکارے' نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔''

قرآن فی الحقیقت ایک ایسی تحریک برپا کرنا چاہتا ہے جس کے تحت ہر خدا پرست نیکی کا علمبردار بن کر بدی کے خلاف میدان میں اترے' بدی کی قوت کے بالمقابل نیکی کی قوت باقاعدہ محاذ آرا ہو۔ یہی وہ بنیادی مشن ہے جس کے لئے قرآن ایسے لوگوں کی تلاش میں ہے جنہیں وہ اس مشن کے شہداء (علمبردار) بنانا چاہتا ہے۔

(۸)

نیکی کی تلقین کرنے اور بدی کا انسداد کرنے کا درس دینے کے ساتھ ساتھ قرآن یہ تصور بھی دلاتا ہے کہ نیکی کسی جزوی عمل کا' یا چند جزوی وظائف کے مجموعہ کا نام نہیں' بلکہ نیکی ساری زندگی پر پھیلا ہوا ایک نظام ہوتی ہے۔

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (البقرة)

''نیکی اس کا نام نہیں ہے کہ تم بس (نمازوں میں) اپنے مُنہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بخلاف اس کے نیکی تو اُس شخص کی ہے جو ایمان لائے اللہ اور یومِ آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور انبیاء پر' وہ جو اپنا مال اسے عزیز رکھنے کے باوجود قرابت داروں' یتیموں' مساکین' مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے اور لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں خرچ کرے' اور وہ نماز قائم کرے' زکوٰۃ دے' اور وہ لوگ جو وعدہ کریں تو ایفاء کرنے والے ہوں' اور وہ لوگ جو سخت حالات میں اور مصیبت کے مواقع پر اور (جنگ کے) مصائب میں صبر سے کام لینے والے ہوں' یہ ہیں وہ لوگ جو سچے نکلے اور یہی لوگ ہیں جو اہل تقویٰ ہیں۔''

دیکھئے یہاں افکار و اعمال اور اعتقادات و اخلاق سبھی کچھ مذکور ہے۔ مصلّٰی سے لے کر میدانِ جنگ تک سارے مراحل سامنے آ گئے۔ مالی اور اقتصادی امور بھی شمار کرا دیئے گئے۔ اتنی ساری چیزوں کو اختیار کر کے پوری زندگی کو ایک خاص نقشے پر ڈھالنا ہے' ظاہر ہے کہ اس وسیع تصورِ نیکی کے ساتھ فرد کسی بگڑے ہوئے معاشرے کے درمیان اپنے آپ کو پوری طرح سنوار نہیں سکتا۔ اسے پورے معاشرے کو سنوارنا ہوگا اور اس کے لئے ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔

(۹)

پیچھے سے جو کڑیاں ملتی چلی آ رہی ہیں وہ ایک سلیم الطبع شخص کو از خود اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ مسلکِ عبادتِ ربّ یا دینِ اسلام پر چلنے والا تقویٰ کیش آدمی بدی کی طاقتوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اس کا اعتقاد اور اس کی دعوت اور اس کا مشن فطری طور پر مخالف چیزوں سے تصادم کا باعث بنتا ہے۔ جو شخص حق کو لے کے چلے اسے باطل سے رشتہ توڑنا ہوگا'

جو نیکی کو اختیار کرے اس کا بدی سے بگاڑ ضرور پیدا ہوگا' جو ربّ کو معبود بنائے اس کی بات پھر طاغوت سے نہ بن سکے گی۔ اس لئے قرآن ان لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے جو ربّ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ طاغوت سے کنارہ کش ہو جائیں۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ (النحل:٣٦)

''اور ہم نے ہر اُمت کے اندر کوئی نہ کوئی رسول (اس پیغام کے ساتھ) مامور کیا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے کنارہ کشی اختیار کرو۔''

طاغوت ہر وہ چیز ہے جو اللہ کی عبادت سے ہٹا کر اللہ کی نافرمانی کرنے پر مائل یا مجبور کرے یا اس کا سبب بنے۔ طاغوت اشخاص و افراد بھی ہو سکتے ہیں' طاغوت فلسفہ و نظریات بھی ہو سکتے ہیں اور طاغوت سیاسی اور اقتصادی نظام بھی ہو سکتا ہے۔ جس شکل میں بھی طاغوت کا وجود پایا جائے اس سے انکار اور اس کی تردید کرنا اس شخص کے لئے لازم ہو جاتا ہے جو قرآن کا شاگرد بن کر ایمان باللہ اور عبادتِ ربّ کی راہ اختیار کرے۔

اپنی اس بنیادی تعلیم اور تلقین میں قرآن کوئی ابہام نہیں چھوڑتا اور لگی لپٹی نہیں رہنے دیتا۔ ملاحظہ ہو:

﴿وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الشعراء)

''اور حدیں پھاند جانے والوں کی اطاعت نہ کرو۔''

﴿.....وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ (الدھر)

''اور ان لوگوں میں سے نافرمانوں اور ناشکروں کی اطاعت نہ کرو۔''

اس سے بھی آگے قرآن نے بدی کی طاقتوں سے تعاون کو ممنوع ٹھہرا دیا۔

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ:٢)

''اور گناہ اور نافرمانی کے کاموں میں (کسی سے) تعاون نہ کرو۔''

(١٠)

یہ بات جب واضح ہو گئی کہ عبادتِ ربّ کے ساتھ اطاعتِ طاغوت چلنے کی چیز نہیں اور امر بالمعروف کا کام کرنے والے اثم و عدوان سے تعاون نہیں کرتے' تو پھر یہ حقیقت قرآن کے طالب علم پر از خود کھل جاتی ہے کہ اسلام کسی مخالفِ اسلام طاقت کے غلبے میں

اپنے پورے تقاضوں کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

پس ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مشن خود غالب طاقت بن جائے۔

اسی اصول پر قرآن اپنے مخاطب کو یہ تلقین کرتا ہے کہ عبادتِ ربّ کے نظام اور مسلک اسلام کو غالب کرو۔

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اسے ہر دوسرے طریقہ ونظام پر غالب کردے۔''

﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا﴾ (التوبۃ:۴۰)

''اور اللہ کا کلمہ (قانون یا دین) بلند و برتر ہو کے رہنے کے لئے ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ﴾ (المجادلۃ:۲۱)

''اللہ نے یہ بات طے کردی کہ مجھے اور میرے رسولوں (یعنی ان کے دین ونظام) کو غالب ہو کے رہنا ہے۔''

مختصر بات یہ ہوئی کہ قرآن اپنے پیغام کو معاشرے میں کامیاب اور عملاً جاری وساری دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔

(۱۱)

مخالف نظاموں سے انکار و اجتناب اور عدم تعاون سے بات آگے بڑھ کر یہاں آ پہنچی کہ جو اربابِ تدبر و تفکر اپنے ربّ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں' زندگی اس کی عبادت کے لئے وقف کردیں' اس کے مقرر کردہ مشن امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کا کام محض واعظوں کا سا ٹھنڈا کام نہیں ہے بلکہ ان کے لئے لازم ہے کہ وہ قرآن کے نظام کو عملاً غلبہ دلانے کی جدوجہد کریں۔

قرآن کی رو سے بھی اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ مشیت کے تحت بھی حق و باطل کا تصادم ناگزیر ہے۔

اس کشمکش کی کٹھالی کے پیشِ نظر قرآن اپنے شاگرد کو بتاتا ہے کہ جنت کی منزل کامرانی

کو جانے والا راستہ بڑا مردافگن ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾ (البقرۃ)

''کیا تم نے یہ گمان باندھ رکھا کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے' حالانکہ ابھی تم پر پہلے کے لوگوں جیسے سخت حالات نہیں گزرے' جن کو تنگی اور مصیبت نے آدبوچا اور وہ اس حد تک جھنجھوڑ دیئے گئے کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس مرحلے پر اُن کو مژدہ سنایا گیا کہ) سنو! اللہ کی مدد قریب ہے۔''

اس کشمکش کے لئے قرآن اپنی تحریک (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کے آدمی سے یہ بات پہلے ہی قدم پر طے کر لیتا ہے کہ وہ اس راہ پر آئے تو اللہ سے اپنے جان و مال کا سودا کر کے آئے۔

اور اس کے لئے وہ اپنے پیغام پر لبیک کہنے والوں کی ایک جماعت بناتا ہے اور اس جماعت کا نام حزب اللہ رکھتا ہے جسے حزب الشیطان سے معرکہ آرا ہونا ہے۔ قرآن کا پیغام یہ ہے کہ اس کے پیغام کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے اجتماعی اور منظم سعی ضروری ہے۔

(۱۲)

قرآن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جس تحریک کو چلا کر دنیا میں امن وسلامتی کا دَور پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی کامیابی کی صورت میں وہ مطالبہ کرتا ہے کہ دین کا پورا نظام اور قرآن کا سارا قانون جاری کیا جائے۔ اس سے حیاتِ طیبہ اور حیاتِ صالحہ اور حیاتِ مطمئنہ پیدا ہوتی ہے۔

یہاں مقالہ ختم ہو رہا ہے۔ اس موقع پر یاد دلانا ضروری ہے کہ قرآن کا مرکزی پیغام جو اس مقالہ میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے' وہ بس ایک ہی ہے: ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ باقی ساری چیزیں اسی کے تقاضے ہیں۔ oo

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

از: لطف الرحمٰن خان

نظر ثانی: حافظ نذیر احمد ہاشمی

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۱۲۱

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾

ترکیب: "اٰتَیْنَا" کا فاعل "نَا" ضمیر بارز مرفوع متصل ہے نہ کہ "نَحْنُ" جو ضمیر مرفوع منفصل ہے۔ اس کا مفعولِ اوّل "هُمْ" کی ضمیر ہے جو "اَلَّذِیْنَ" کے لئے ہے اور اس کا مفعول ثانی "اَلْكِتٰبَ" ہے۔ یہ پورا جملہ "اَلَّذِیْنَ" کا صلہ ہے۔ اور یہ صلہ اور موصول مل کر مبتدأ ہے۔ "یَتْلُوْنَ" کا فاعل واؤ ضمیر مرفوع بارز متصل ہے جو "اَلَّذِیْنَ" کے لئے ہے' اس کا مفعول "ہٗ" کی ضمیر ہے جو "اَلْكِتٰبَ" کے لئے ہے' جبکہ مرکب اضافی "حَقَّ تِلَاوَتِهٖ" صفت ہے اور موصوف "تِلَاوَةً" محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: تِلَاوَةً حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اور پھر یہ مفعول مطلق ہے۔ "یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ" یہ جملہ فعلیہ ہو کر خبر اوّل "اُولٰٓئِكَ" مبتدأ ہے اور جملہ فعلیہ "یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ" اس کی خبر ہے۔ پھر یہ مبتدأ و خبر مل کر جملہ اسمیہ ہو کر دوسری خبر ہے۔ اور یہ ترتیب محی الدین درویش نے اپنی کتاب اعراب القرآن میں کی ہے۔ جبکہ عکبری نے املاء ما منّ بہ الرحمان میں لکھا ہے کہ "بِهٖ" میں "ہٖ" کی ضمیر "اَلْكِتٰبَ" کے لئے ہے۔ "مَنْ" شرطیہ ہے اس لئے "یَكْفُرْ بِهٖ" مضارع مجزوم ہے اور یہ شرط ہے۔ جبکہ

''فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ'' جواب شرط ہے۔ ''يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ'' کا جملہ ''هُمْ'' ضمیر یا ''الْكِتٰبَ'' سے حال ہونے کی بنا پر مقام نصب میں ہے ''اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ'' کی خبر نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ سب کے سب اس کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے اور ظاہر ہے کہ اہل کتاب کے سارے کے سارے افراد ایسے نہیں ہیں۔

حق کے اصلی معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں اور اس کا استعمال چار طرح ہوتا ہے:

(۱) اُس ذات کے لئے جو اپنی حکمت کے اقتضاء کی بناء پر کسی شے کی ایجاد فرمائے۔ اللہ عزوجل کو اسی لئے حق کہا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقِّ﴾ (یونس:۳۰) ﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ﴾ (یونس:۳۲)

(۲) وہ چیز کہ جو حکمت کے اقتضاء کے مطابق ایجاد کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کل فعل حق ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ﴾ (یونس:۵)

(۳) کسی شے کے متعلق وہ اعتقاد رکھنا جو نفس الامر کے مطابق ہو۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ﴾ (البقرۃ:۲۱۳)

(۴) وہ قول یا فعل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو کہ جس مقدار اور جس وقت میں اس کا ہونا واجب ہے۔ چنانچہ قولِ حق اور فعلِ حق اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ﴾ (السجدۃ:۱۳)

آیت زیر بحث میں ''حق'' کا مؤخر الذکر مفہوم مراد ہے۔

ترجمہ

اَلَّذِيْنَ: وہ لوگ	اٰتَيْنٰهُمُ: ہم نے دی جن کو
الْكِتٰبَ: کتاب	يَتْلُوْنَهٗ: وہ لوگ تلاوت کرتے ہیں اس کی
حَقَّ تِلَاوَتِهٖ: جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے	اُولٰئِكَ: وہ لوگ

يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ :ایمان لاتے ہیں اس پر　　وَمَنْ :اور جو
يَكْفُرْ بِهٖ :انکار کرتا ہے اس کا　　فَاُولٰٓئِكَ :تو وہ لوگ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ :ہی خسارہ پانے والے ہیں

نوٹ (۱) اس آیت کے الفاظ عمومیت کے حامل ہیں۔ اس لئے شریعت موسویؑ میں تورات، شریعت عیسویؑ میں انجیل اور شریعت محمدیؐ میں قرآن مجید پر ''الْكِتٰب'' کا اطلاق ہوگا۔

نوٹ (۲) لفظ تلاوت کا مطلب ہے کتاب پڑھ کر اس کی پیروی کرنا۔ اس لئے ''حَقَّ تِلَاوَتِهٖ'' کا تعلق شریعت پر عمل کرنے سے ہے۔ اسی طرح ''يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ'' اور ''يَكْفُرْ بِهٖ'' ایمانِ عملی اور انکارِ عملی کے لئے آیا ہے۔ اور شریعت پر عمل نہ کرنے والے کا شمار خسارہ پانے والوں میں ہوگا۔

نوٹ (۳) شریعت موسویؑ اور شریعت عیسویؑ کے زمانے میں سمجھ اور عمل کے بغیر مجرد تورات یا انجیل کی تلاوت بھی ثواب سے خالی نہیں تھی۔ اسی طرح آج کے زمانے میں مجرد قرآن مجید کی تلاوت بھی ثواب سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اس ثواب کے ہوتے ہوئے بھی شریعت پر عمل نہ کرنا خسارے کا سودا ہے۔ کیونکہ جنت میں کم تر درجہ پانا بھی خسارہ ہے، براستہ (via) جہنم، جنت میں جانا بھی خسارہ ہے، اور جس کے لئے خلود فی النار کا حکم ہوگا تو وہ خسارے کی انتہا ہے۔

آیات ۱۲۲، ۱۲۳

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ ''يَا'' حرفِ ندا ''بَنِيْ'' منادیٰ مضاف، علامت نصب ''یاء'' ہے، کیونکہ یہ ملحق جمع مذکر سالم ہے۔ ''ابْنٌ'' کی اصل ''بَنَوٌ'' بروزن ''فَعَلٌ'' ہے۔ ناقص واوی ہے اور دلیل یہ ہے کہ اس کا مصدر ''بُنُوَّةٌ'' ہے۔ اس کی جمع مکسر ''اَبْنَاءٌ'' اور جمع سلامت ''بُنُوْنَ'' آتی ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اس کا لام کلمہ بجائے ''واؤ'' کے ''یاء'' ہے اور یہ ناقص یائی ہے۔ اور یہ مشتق ہے بَنٰى يَبْنِيْ بِنَاءً بمعنی وَضَعَ الشَّيْءَ عَلَى الشَّيْءِ سے۔ چونکہ ''ابن'' فرع ہونے

کی بناء پر موضوع اور ''اَبٌ'' اصل ہونے کی بناء پر موضوع علیہ ہے۔ باقی رہا اس کے مصدر کا ''بُنُوَّةٌ'' کے وزن پر آنا تو یہ اس کے ناقص واوی ہونے کی دلیل نہیں' کیونکہ فَتٰی جو ناقص یائی ہے اس کا مصدر بھی ''فُتُوَّةٌ'' کے وزن پر آتا ہے۔ ''اسرائیل'' اسباب منع صرف میں سے علمیت اور عجمہ ہونے کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ اس کے مختلف تلفظ ہیں: اسرائیل' سراییل' اسرایل' اسرال اور اسرائین۔

اسی انداز کی آیت کریمہ چونکہ پہلے گزر چکی ہے اس لئے ترکیب کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

ترجمہ

یٰبَنِیۡ اِسۡرَآءِیۡلَ :اے اسرائیل کے بیٹو	اذۡکُرُوۡا :تم لوگ یاد کرو
نِعۡمَتِیَ :میری نعمت کو	الَّتِیۡۤ :جس کو کہ
اَنۡعَمۡتُ :میں نے انعام کیا	عَلَیۡکُمۡ :تم لوگوں پر
وَاَنِّیۡ :اور یہ کہ	فَضَّلۡتُکُمۡ :میں نے فضیلت دی تم لوگوں کو
عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ :سب جہانوں پر	وَاتَّقُوۡا :اور تم لوگ بچو
یَوۡمًا :ایک ایسے دن سے جب	لَّا تَجۡزِیۡ :کام نہیں آئے گی
نَفۡسٌ :کوئی جان	عَنۡ نَّفۡسٍ :کسی جان کے
شَیۡـًٔا :کچھ بھی	وَّلَا یُقۡبَلُ :اور قبول نہیں کیا جائے گا
مِنۡهَا :اس سے	عَدۡلٌ :بدلے میں کچھ
وَّلَا تَنۡفَعُهَا :اور نفع نہیں دے گی اس کو	شَفَاعَةٌ :کوئی شفاعت
وَّلَا هُمۡ :اور نہ ہی وہ لوگ	یُنۡصَرُوۡنَ :مدد دیئے جائیں گے

نوٹ (۱) بلیغ کلام کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ بات کی ابتداء جامع بات سے ہوتی ہے' پھر اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے' اور بات ختم کرتے وقت خلاصہ کے طور پر جامع بات کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ جیسے ہم کہیں ''تکبر بہت بُری چیز ہے''۔ پھر تکبر کی تعریف' اس کی علامات' اس کے اثرات اور نقصانات بیان کرنے کے بعد بات ختم کرتے ہوئے کہیں ''غرضیکہ تکبر بہت بُری چیز ہے''۔

آیات زیر مطالعہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۴۷ کو لفظ بہ لفظ اور آیت ۴۸ کو تھوڑی سی

لفظی تبدیلی کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔ یہ وہی بلاغت کا انداز ہے اور اس سے معلوم ہو گیا کہ بنواسرائیل سے براہِ راست خطاب اب اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔

آیت ۱۲۴

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

ت م م

تَمَّ (ض) تَمَامًا: کسی چیز کی ہر کمی یا نقص کا دور ہو جانا' پورا ہونا' تمام ہونا۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ (الانعام:۱۱۵) ''اور پورا ہوا تیرے ربّ کا فرمان۔''

أَتْمَمَ۔ اِتْمَامًا (افعال): پورا کرنا' تمام کرنا۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج میں نے مکمل کیا تمہارے لئے تمہارے دین کو اور میں نے تمام کی تم پر اپنی نعمت۔''

اَتْمِمْ (فعل امر): تو پورا کر۔ ﴿رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ (التحریم:۸) ''اے ہمارے رب! تو پورا کر دے ہمارے لئے نور کو۔''

مُتِمٌّ (اسم الفاعل): پورا کرنے والا۔ ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ﴾ (الصف:۸) ''اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے۔''

ذ ر ی

ذُرِّيَّةٌ: اولاد۔ اصل میں چھوٹے بچوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے' مگر عرف میں چھوٹی اور بڑی سب اولاد کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اصلاً تو یہ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ ''ذُرِّيَّةٌ'' کے ماخذ کے بارے میں تین اقوال ہیں: (۱) یہ ''ذَرْءٌ'' سے مشتق ہے جس کے معنی پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں' اس کی ہمزہ متروک ہو گئی ہے' جیسے ''بَرِيَّةٌ'' میں۔ (۲) اس کی اصل ''ذُرْوِيَةٌ'' ہے۔ (۳) یہ ''ذَرٌّ'' سے مشتق ہے جس کے معنی بکھیرنے کے ہیں۔ ''فُعِّيلَةٌ'' کے وزن پر ہے' جیسے ''قُمْرِيَّةٌ''۔ ''ذُرِّيٌّ'' اور ''ذُرِّيَّاتٌ'' جمع۔

ن ی ل

نَالَ (ف) نَيْلًا: (۱) مطلوبہ چیز کو حاصل کرنا (۲) مطلوب کا پہنچنا۔ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ

حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ (آل عمران:۹۲) ''تم لوگ ہرگز حاصل نہیں کرو گے نیکی کو یہاں تک کہ تم لوگ انفاق کرو اُس میں سے جو تم کو محبوب ہے۔'' ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا﴾ (الحج:۳۷) ''ہرگز نہیں پہنچتا اللہ کو ان کا گوشت اور نہ ہی ان کا خون۔''

نَيْلٌ (اسم ذات): مطلوبہ چیز۔ ﴿وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا﴾ (التوبۃ:۱۲۰) ''اور وہ لوگ حاصل نہیں کرتے کسی دشمن سے کوئی مطلوبہ چیز۔''

ترکیب: ''اِذْ'' فعل محذوف کا مفعول فیہ ہونے کی بنا پر مقام نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''اُذْکُرْ اِذِ ابْتَلٰی'' ''اِبْتَلٰی فعل'' ''اِبْرٰھٖمَ'' مفعول اور ''رَبُّہٗ'' فاعل ہے۔ ''رَبُّہٗ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر ابراھیمَ کے لئے ہے جبکہ ''بِکَلِمٰتٍ'' متعلق فعل ہے۔ ''فَا'' عاطفہ ''اَتَمَّ'' فعل اس کا فاعل اس میں شامل ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو ابراہیمؑ کے لئے ہے اور ''ھُنَّ'' ضمیر مفعولی ہے جو ''کَلِمٰتٍ'' کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ عطف ہے اِبْتَلٰی پر۔ ''اِنِّیْ'' میں ''اِنَّ'' کے ساتھ اس کا اسم یائے متکلم ہے اور ''جَاعِلُكَ اِمَامًا'' اس کی خبر ہے۔ جبکہ ''لِلنَّاسِ'' متعلق جَاعِلُكَ ہے۔ یا یہ حال ہونے کی بناء پر مقام نصب میں ہے اور عبارت یوں ہے: انی جاعلك امامًا للناس۔ اسم الفاعل ''جَاعِلٌ'' مضاف ہونے کی وجہ سے ''جَاعِلُ'' آیا ہے اور فعل کا کام کر رہا ہے۔ ضمیر مفعولی ''كَ'' اس کا مفعول اوّل اور ''اِمَامًا'' مفعول ثانی ہے۔ ''لَا يَنَالُ'' کا فاعل ''عَهْدِیْ'' ہے اور ''الظّٰلِمِيْنَ'' مفعول ہے۔ ''قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ'' اصل میں ''قَالَ اجْعَلْ فَرِيْقًا مِنْ ذُرِّيَّتِیْ اِمَامًا'' ہے۔

ترجمہ

وَاِذِ ابْتَلٰی: اور جب آزمایا	اِبْرٰھٖمَ: ابراہیمؑ کو
رَبُّہٗ: ان کے ربّ نے	بِکَلِمٰتٍ: کچھ فرمانوں سے
فَاَتَمَّھُنَّ: تو انہوں نے پورا کیا ان کو	قَالَ: اس نے (یعنی اللہ نے) کہا
اِنِّیْ: کہ میں	جَاعِلُكَ: بنانے والا ہوں آپؑ کو
لِلنَّاسِ: لوگوں کے لئے	اِمَامًا: ایک پیشوا
قَالَ: انہوںؑ نے کہا	وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ: اور میری نسل میں سے
قَالَ: اس نے کہا	لَا يَنَالُ: نہیں پہنچتا
عَهْدِیْ: میرا وعدہ	الظّٰلِمِيْنَ: چیزوں کو غلط جگہ رکھنے والوں کو

نوٹ (۱) اس آیت میں ہماری راہنمائی کے متعدد پہلو ہیں۔ ان میں سے چند کو سمجھ کر

ذہن نشین کرلیں۔(۱)''اِبْتَلٰی'' کے فاعل کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے لفظ ربّ آیا ہے۔ربّ اُس ہستی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر اس کے درجۂ کمال تک پہنچا دے۔اس سے معلوم ہو گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشیں نعوذ باللہ کسی غلطی یا خطا کی پاداش میں نہیں تھیں' بلکہ ان کی تربیت کی غرض سے تھیں۔

(۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحانات کی نوعیت علمی (Theoritical) نہیں تھی' بلکہ (Practical) تھی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عملی ثابت قدمی یعنی صبر سے علم اور یقین' دونوں کی کیفیت از خود عیاں ہو جاتی ہے۔اور جب کسی انسان کا علم و یقین عمل میں ڈھلتا ہے تو اس کا نقد انعام ہے لوگوں کی امامت۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل میں امامت کا جو سوال کیا تھا وہ دُنیوی غرض سے نہ تھا بلکہ آخرت کے رتبہ اور مقام کے لئے تھا۔اس سے واضح ہو گیا کہ ہم لوگ جو بھی نیک اعمال کرتے ہیں اس کا فائدہ ہمارے آباء واجداد کو پہنچتا ہے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا اللہ تعالیٰ نے جو جواب دیا وہ منفی نہیں بلکہ مثبت ہے۔البتہ مشروط ہے۔اس لئے لَا یَنَالُ سے پہلے نَعَمْ وَلٰکِنْ محذوف مان کر پڑھیں تو بات پوری طرح سمجھ میں آجائے گی۔

(۵) اللہ تعالیٰ کے مشروط جواب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امامت کے مقام و رتبہ کا تعلق نسل سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ امامت دراصل زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے اور یہ کسی باغی یا نافرمان کو نہیں دی جاسکتی۔

آیت ۱۲۵

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَا اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ ﴾

ب ی ت

بَاتَ (ض) بَیْتًا: کسی جگہ رات گزارنا۔﴿وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾﴾ (الفرقان:) ''اور وہ لوگ جو رات گزارتے ہیں اپنے ربّ کے لئے سجدے کی حالت میں اور قیام کی حالت میں۔''

بَیْتٌ ج بُیُوْتٌ (اسم ذات): رات گزارنے کا ٹھکانہ' گھر۔ ﴿اَوْ یَکُوْنَ لَکَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ (بنی اسراءیل:۹۳) ''یا ہوتا تیرے لئے کوئی گھر سنہرا۔'' ﴿لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا﴾ (النور:۲۷) ''تم لوگ داخل مت ہو کچھ گھروں میں اپنے گھروں کے علاوہ' یہاں تک کہ اجازت طلب کرلو۔''

بَیَاتٌ (اسم ذات): رات۔ ﴿اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَیَاتًا اَوْ نَهَارًا﴾ (یونس:۵۰) ''اگر پہنچے' تم لوگوں کو اس کا عذاب رات کے وقت یا دن کے وقت۔''

تَبْیِیْتًا (تفعیل): (۱) رات میں حملہ کرنا' شب خون مارنا۔ (۲) رات میں سوچ بچار کرنا' مشورہ کرنا۔ ﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَیِّتَنَّهٗ﴾ (النمل:۴۹) ''انہوں نے کہا آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ ہم لازماً شب خون ماریں گے اس پر۔'' ﴿وَاللّٰهُ یَكْتُبُ مَا یُبَیِّتُوْنَ﴾ (النساء:۸۱) ''اور اللہ لکھتا ہے جو وہ لوگ رات میں مشورہ کرتے ہیں۔''

ط و ف

طَافَ (ن) طَوَافًا: کسی کے گرد چکر لگانا' گھیرنا۔ ﴿یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ﴾ (الطور:۲۴) ''چکر لگاتے ہیں ان کے گرد کچھ خدام اُن کے لئے۔''

یُطَافُ (مضارع مجہول): چکر دیا جانا' گردش میں لایا جانا۔ ﴿یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ﴾ (الصّٰفّٰت) ''گردش دیئے جائیں گے ان کے لئے شراب کے جام۔''

طَائِفٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل): چکر لگانے والا' گھیرنے والا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) ذہن میں گردش کرنے والا خیال' وسوسہ۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا﴾ (الاعراف:۲۰۱) ''بیشک جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کو جب بھی چھوتا ہے کوئی وسوسہ شیطان سے تو وہ لوگ خود کو یاد کراتے ہیں۔'' (۲) کوئی آفت جو انسان پر گھوم جائے۔ ﴿فَطَافَ عَلَیْهَا طَائِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُوْنَ﴾ (القلم:۱۹) ''تو چکر لگایا اس پر ایک آفت نے آپؐ کے ربّ کی طرف سے اس حال میں کہ وہ لوگ سو رہے تھے۔'' (۳) طواف کرنے والا۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

طَائِفَةٌ: فَاعِلٌ کے مؤنث فَاعِلَةٌ کا وزن ہے۔ اس کا زیادہ تر استعمال کسی بڑی جماعت کے چھوٹے گروہ کے لئے ہوتا ہے۔ ﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَكُمْ﴾ (آل عمران:۶۹) ''تمنا کی اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہ کاش وہ لوگ

بھٹکا دیں تم لوگوں کو۔''

طَوَّافٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ): بار بار چکر لگانے والا' خادم۔ ﴿طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ﴾ (النور:۵۸) ''بار بار چکر لگانے والے ہیں تمہارے گرد' تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔''

طُوْفَانٌ (فُعْلَانٌ کے وزن پر مبالغہ): بے انتہا گھیرنے والا۔ زیادہ تر انتہائی تیز ہوا اور بارش کے لئے آتا ہے' سائیکلون (Cyclone)۔ ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ﴾ (الاعراف:۱۳۳) ''تو ہم نے بھیجا ان پر سائیکلون۔''

ع ك ف

عَكَفَ (ن) عَكْفًا: تعظیماً کسی سے وابستہ رہنا' چپکے بیٹھے رہنا (لازم)' وابستگی سے روکنا (متعدی)۔ ﴿فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ﴾ (الاعراف:۱۳۸) ''تو وہ لوگ پہنچے ایک قوم پر جو چپکے بیٹھے رہتے ہیں اپنے بتوں پر۔''

عَاكِفٌ (اسم الفاعل): رُکا رہنے والا' اعتکاف کرنے والا۔ ﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ﴾ (الشعراء) ''انہوں نے کہا ہم عبادت کرتے ہیں کچھ بتوں کی تو ہم ہو جاتے ہیں ان کے لئے اعتکاف کرنے والے۔''

مَعْكُوْفٌ (اسم المفعول) روکا ہوا۔ ﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ﴾ (الفتح:۲۵) ''اور قربانی کے جانور روکے گئے ہیں کہ وہ پہنچیں اپنی جگہ پر۔''

ترکیب: ''جَعَلْنَا'' کا فاعل ''نَا'' ضمیر بارز مرفوع متصل ہے (نہ کہ ''نَحْنُ'' جو ضمیر مرفوع منفصل ہے) جو اللہ کے لئے ہے۔ ''جَعَلْنَا'' کا مفعول اوّل ''اَلْبَيْتَ'' ہے اور اس پر لام تعریف لگا ہے' جبکہ ''مَثَابَةً'' مفعول ثانی ہے۔ یہ ترکیب اس صورت میں ہے اگر ''جَعَلْنَا'' کو بمعنی ''صَيَّرْنَا'' لیا جائے۔ اور اگر ''جَعَلْنَا'' بمعنی ''خَلَقْنَا'' لیا جائے تو ''مَثَابَةً'' مفعول ثانی نہیں بلکہ ''اَلْبَيْتَ'' سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہوگا' کیونکہ اس صورت میں ''جَعَلْنَا'' متعدی بیک مفعول ہوگا۔ ''لِلنَّاسِ'' یا تو صفت ہے مَثَابَةً کی اور تقدیر عبارت یوں ہے: مَثَابَةً كَائِنَةً لِلنَّاسِ۔ اس صورت میں یہ كَائِنَةً محذوف کے متعلق ہوگا اور یا ''جَعَلْنَا'' کے متعلق ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: لِاَجْلِ نَفْعِ النَّاسِ۔ ''اَمْنًا'' مصدر ہے اور ''مَثُوْبَةً'' پر عطف ہے۔

''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى'' ''اِتَّخِذُوْا'' فعل یا فاعل ''مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ'' متعلق ''اِتَّخِذُوْا'' ''مُصَلًّى'' مفعول بہ جملہ فعلیہ مقولہ (مفعول) ہے فعل محذوف ''قُلْنَا'' کا جو

معطوف ہے ''وَاِذْ جَعَلْنَا'' پر اور عبارت یوں ہے: ''وَقُلْنَا اتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى''۔ ''مُصَلًّى'' باب تفعیل کا اسم ظرف ہے۔ ''اَلْعٰكِفِيْنَ'' ''اَلرُّكَّعِ'' اور ''اَلسُّجُوْدِ'' یہ سب ''لِلطَّآئِفِيْنَ'' پر داخل ہونے والے حرف جر ''لِ'' کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں۔

ترجمہ

وَاِذْ جَعَلْنَا : اور جب ہم نے بنایا	اَلْبَيْتَ : اس گھر کو
مَثَابَةً : اپنے اصل کی طرف لوٹنے کا ایک ٹھکانہ	لِّلنَّاسِ : لوگوں کے لئے
وَاَمْنًا : اور امن میں ہونا	وَاتَّخِذُوْا : اور تم لوگ بناؤ
مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ : ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ میں سے	مُصَلًّى : نماز کی جگہ
وَعَهِدْنَا : اور ہم نے تاکید کی	اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ : ابراہیمؑ کو اور اسماعیلؑ کو
اَنْ طَهِّرَا : کہ وہ دونوں پاک رکھیں	بَيْتِيَ : میرے گھر کو
لِلطَّآئِفِيْنَ : طواف کرنے والوں کے لئے	وَالْعٰكِفِيْنَ : اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے
وَالرُّكَّعِ : اور رکوع کرنے والوں کے لئے	السُّجُوْدِ : سجدہ کرنے والوں کے لئے

نوٹ (۱) لفظ ''مَثَابَةً'' کے معنی ''اپنے اصل کی طرف لوٹنے کا ایک ٹھکانہ'' ہیں۔ بار بار لوٹنے کا مفہوم از خود شامل ہے۔ جیسے ہر شخص سارا دن گھوم پھر کر شام کو اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے۔ اس کی تصدیق ایک حدیثِ قدسی سے ہوتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بندہ ایسا ہو کہ میں نے اس کو صحت عطا کر رکھی ہے اور اس کی روزی میں وسعت دے رکھی ہے اور اس پر پانچ سال ایسے گزر جائیں کہ وہ میرے دربار میں حاضر نہ ہو تو وہ یقیناً محروم ہے۔ اسی مضمون کی کئی اور احادیث بھی روایت کی گئی ہیں (منقول از فضائل حج، صفحہ ۳۴) یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک عمرہ کرنا واجب ہے، جبکہ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سنت ہے۔

اب جب کبھی کسی اخبار یا رسالہ میں آپ کوئی ایسا مضمون یا ایڈیٹر کے نام خط پڑھیں جس میں نفلی حج اور عمرہ پر کئے جانے والے اخراجات کو wastage اور ملکی معیشت کے لئے

نقصان دہ قرار دیا گیا ہو اور اس پیسے کے زیادہ مفید استعمال بتائے گئے ہوں' تو اس وقت آپ آیت زیر مطالعہ' مذکورہ حدیث قدسی اور ائمہ کرام کے اقوال کو ذہن میں ضرور تازہ کرلیا کریں۔ اس طرح آپ پیسے کو اپنا الٰہ بنانے کے شرک سے ان شاء اللہ محفوظ رہیں گے۔

نوٹ (۲) طواف کے بعد دو رکعت نماز کا واجب ہونا اس آیت سے معلوم ہوا اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ "مِنْ" کے اضافے سے معلوم ہوا کہ یہ حرم مکہ میں کہیں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ حجۃ الوداع میں بی بی اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو طواف کے بعد نماز کا موقع نہیں ملا تو مکہ شہر سے نکلنے کے بعد ادا کی۔ (معارف القرآن)۔

آیت ۱۲۶

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾

ب ل د

بَلَدَ (ن) بُلُوْدًا: کسی جگہ آباد ہونا' شہر بنانا۔

بَلَدٌ واحد بَلْدَةٌ جمع بِلَادٌ (اسم جنس): شہر' بستی۔ ﴿وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ﴾ (النحل: ۷) "اور وہ (یعنی چوپائے) اٹھاتے ہیں تمہارے بوجھ کسی شہر تک۔" ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۝ لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾ (الفرقان: ۴۸'۴۹) "اور اس نے اتارا آسمان سے کچھ پاکیزہ پانی تاکہ وہ زندہ کرے اس سے کسی مردہ شہر کو۔" ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝﴾ (آل عمران) "ہرگز دھوکہ نہ دے تجھ کو گھومنا پھرنا ان لوگوں کا جنہوں نے کفر کیا' شہروں میں۔"

ص ی ر

صَارَ (ض) صَيْرًا اور مَصِيْرًا: منتقل ہونا' لوٹنا۔ ﴿اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝﴾ (الشوریٰ) "خبردار رہو! اللہ کی طرف ہی لوٹتے ہیں تمام امور۔" ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝﴾ (النور) "اور اللہ کے لئے ہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہت ہے' اور اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے۔"

مَصِيْرٌ: مصدر کے علاوہ اسم الظرف بھی ہے۔ لوٹنے کا ٹھکانہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''رَبِّ'' کی جر بتا رہی ہے کہ اس کی یائے متکلم محذوف ہے اور یہ ''رَبِّیْ'' تھا۔ اس سے قبل حرف ندا ''یَا'' کو بھی محذوف مانا جا سکتا ہے۔ فعل امر ''اِجْعَلْ'' کا مفعول اوّل ''ھٰذَا'' ہے جبکہ مرکب توصیفی ''بَلَدًا اٰمِنًا'' مفعول ثانی ہے۔ فعل امر ''اُرْزُقْ'' کا مفعول ''اَھْلَهٗ'' ہے۔ اس میں ''ہٗ'' کی ضمیر ''بَلَدًا اٰمِنًا'' کے لئے ہے۔ ''مِنَ الثَّمَرٰتِ'' متعلق فعل ہے۔ ''مَنْ'' ''اَھْلَهٗ'' پر حرف عطف نہیں ہے بلکہ اس سے بدل بعض ہے۔ ''قَالَ'' کا فاعل اس میں شامل ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ''وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗ'' میں ''مَنْ'' بمعنی ''اَلَّذِیْ'' موصول ''كَفَرَ'' اس کا صلہ یا ''مَنْ'' نکرہ موصوفہ ''كَفَرَ'' اس کی صفت۔ موصول اور صلہ مل کر یا موصوف اور صفت مل کر فعل محذوف کے لئے مفعول۔ تقدیر عبارت یوں ہے: ''قَالَ وَارْزُقْ مَنْ كَفَرَ''۔ ''فَاُمَتِّعُهٗ'' جملہ فعلیہ معطوف ہے ''وَارْزُقْ'' فعل محذوف پر۔

(نوٹ) ''مَنْ'' کو مبتدا قرار دے کر ''فَاُمَتِّعُهٗ'' کو خبر بنانا بھی جائز ہے کیونکہ ''مَنْ'' بمعنی ''اَلَّذِیْ'' ہے اس لئے ''اَلَّذِیْ'' کی خبر پر ''فاء'' لگانا درست ہے کیونکہ ''اَلَّذِیْ'' اسم موصول متضمن معنی شرط بھی ہے اس لئے اس کی خبر پر فاء لگانا درست ہے۔ علاوہ ازیں ''من'' کو شرطیہ قرار دے کر ''فَاُمَتِّعُهٗ'' کو اس کا جواب قرار دینا بھی درست ہے۔ ''قَلِيْلًا'' صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے جو ''مَتَاعًا'' ہو سکتا ہے۔ یہ مرکب توصیفی ''اُمَتِّعُ'' کا مفعول ثانی ہے جبکہ اس سے متصل ''ہٗ'' کی ضمیر اس کا مفعول اوّل ہے جو ''مَنْ كَفَرَ'' کے لئے ہے۔ ''اَضْطَرُّهٗ'' کی ضمیر مفعولی بھی ''مَنْ كَفَرَ'' کے لئے ہے۔

ترجمہ

وَاِذْ قَالَ : اور جب کہا	اِبْرٰهٖمُ : ابراہیمؑ نے
رَبِّ : اے میرے ربّ!	اجْعَلْ : تو بنا دے
هٰذَا : اس کو	بَلَدًا اٰمِنًا : امن میں ہونے والا شہر
وَّارْزُقْ : اور تو رزق دے	اَهْلَهٗ : اس کے لوگوں کو
مِنَ الثَّمَرٰتِ : پھلوں میں سے	مَنْ : اس کو جو
اٰمَنَ : ایمان لائے	مِنْهُمْ : ان میں سے
بِاللّٰهِ : اللہ پر	وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ : اور آخری دن پر
قَالَ : اس نے کہا	وَمَنْ كَفَرَ : اور جس نے کفر کیا

(باقی صفحہ 64 پر)

دُنیاوی تکلیفوں کی حقیقت

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ اَبِیْ زُھَیْرٍ ؓ قَالَ : اُخْبِرْتُ اَنَّ اَبَابَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ الصَّلَاحُ بَعْدَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ : ﴿لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَا اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَبِہٖ﴾ فَکُلَّ سُوْءٍ عَمِلْنَا جُزِیْنَا بِہٖ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ یَا اَبَابَکْرٍ اَلَسْتَ تَمْرَضُ؟ اَلَسْتَ تَنْصَبُ؟ اَلَسْتَ تَحْزَنُ؟ اَلَسْتَ تُصِیْبُکَ اللَّاْوَاءُ؟)) قَالَ: بَلٰی، قَالَ:((فَھُوَ مَا تُجْزَوْنَ بِہٖ)) [مسند احمد]

''ابوبکر بن ابوزہیر ؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اس آیت کے بعد کیسے بچاؤ ہوگا: ''تمہاری اور اہل کتاب کی خواہشوں کے مطابق نہیں ہوگا' بلکہ جو کوئی برائی کرے گا اسے اس کی سزا ملے گی'' پس ہم نے جو بھی برائی کی ہوگی اس کی سزا ملے گی؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ آپ کو معاف کرے اے ابوبکرؓ! کیا آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو تھکاوٹ نہیں ہوتی؟ کیا آپ کو غم نہیں آتے؟ کیا آپ کو تکالیف نہیں آتیں؟'' انہوں نے عرض کیا: یہ تو ہے! اس پر آپؐ نے فرمایا: ''پس یہ بدلہ ہے آپ کی برائیوں کا''۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حد درجہ مہربان ہے۔ اُس نے سیدھی راہ پر چلنے کے لئے انسانوں کی الہامی کتابوں کے ذریعے راہنمائی کی۔ آخری الہامی کتاب قرآن کریم ہے جو جامع تعلیمات پر مشتمل ہے اور لوگوں کے لئے حق وصداقت کی روشن دلیل ہے۔ پھر اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے' تاکہ حق خالص ترین صورت میں لوگوں کے سامنے رہے اور وہ آسانی سے حق و باطل کے درمیان پہچان کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے برگزیدہ بندوں کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں' راہِ ہدایت کی طرف راہنمائی کریں اور الٰہی تعلیم کو عملی طور پر اپنا کر لوگوں پر حجت قائم کریں۔

لوگ دو قسم کے ہوئے ہیں۔ کچھ وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو قبول کیا اور انبیاء و

رُسل کی پیروی اختیار کی۔ یہ لوگ مسلم کہلائے۔ کچھ وہ جنہوں نے پروردگار کی بھیجی ہوئی راہنمائی کو قبول نہ کیا اور انبیاء پر ایمان نہ لائے۔ ایسے لوگ کافر ٹھہرے۔

کافر گمراہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ وہ بنیادی حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں' لہٰذا ان کا کوئی عمل قبول نہ ہوگا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ (الکھف) ''پس اُن کے اعمال ضائع ہو گئے اور ہم قیامت کے روز اُن کے لئے کچھ بھی وزن قائم نہیں کریں گے''۔ یعنی کافر کا کوئی عمل حسن قرار نہیں پاتا۔

رہے مسلمان تو وہ ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیکی اور بدی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ مگر کوئی مؤمن ایسا نہیں کہ اُس سے معصیت کا ارتکاب نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ خود انسان کی فطرت میں کمزوری رکھ دی گئی ہے۔ از روئے ارشادِ ربانی: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ (النساء) ''اور انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔'' پھر دنیا کی زینت اور کشش اسے برائی پر آمادہ کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیطانِ لعین ہر وقت اُس کو دھوکہ دینے میں لگا ہوا ہے۔ ان حالات میں مؤمن سے بھی بدی کے ارتکاب کا امکان ہر وقت موجود ہے اور گناہ پر سزا کی وعید ہے۔ چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ.....﴾ (النساء:۱۲۳) ''جو کوئی برائی کرے گا اسے اُس کی سزا ملے گی'' تو صحابہ کرام ؓ کے اندر تشویش پیدا ہوئی کہ اگر ہر برائی پر سزا ہے تو پھر سزا سے کون بچے گا۔ چنانچہ زیرِ درس حدیث میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ رسول اللہ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہم نے جو بھی برائی کی ہوگی اس کی سزا ملے گی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ ''اللہ آپ کو بخشے! کیا آپ کبھی بیمار نہیں ہوئے؟ کیا آپ کو کبھی درد نہیں ہوا؟ کیا آپ کو غم نہیں آتے؟ کیا آپ کو تکلیفیں نہیں آتیں؟'' حضرت ابوبکر ؓ نے عرض کیا کہ یہ تو ہے! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''پس یہ بدلہ ہے آپ کی برائیوں کا''۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کے گناہوں کی بخشش کے لئے ایک صورت یہ بھی رکھ دی گئی کہ دنیاوی تکالیف کے بدلے میں اہل ایمان کی خطائیں معاف کر دی جائیں۔ مؤمن جب بیمار ہوتا ہے تو اُس کے گناہ جھڑتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مردِ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے' مرض سے یا اُس کے علاوہ' اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح خزاں رسیدہ درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے''۔ (بخاری و مسلم) چنانچہ

رسول اللہ ﷺ جب کسی بیمار کی تیمارداری کے لئے جاتے تو اسے تسلی دیتے ہوئے فرماتے کہ یہ بیماری تمہارے گناہوں کو دور کر دے گی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٥٦﴾﴾ (البقرة)

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے' بھوک سے اور جانی اور مالی نقصان سے۔ تو (ان مشکلات میں) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے' (وہ ایسے لوگ ہیں) کہ جب انہیں کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اُسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔''

صبر کرنے والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ دکھ اور تکلیف میں حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے اور ناسازگار حالات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں اور ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور ایسا کرنے والوں کے گناہ مٹتے اور نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے بعض ایمان والے بندوں یا ایمان والی بندیوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصائب اور حوادث آتے رہتے ہیں' کبھی اس کی جان پر' کبھی اس کے مال پر' کبھی اس کی اولاد پر (اور اس کے نتیجہ میں اس کے گناہ جھڑتے رہتے ہیں)' یہاں تک کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے حضور اس حال میں پہنچتا ہے کہ اس کا ایک گناہ بھی باقی نہیں ہوتا''۔ (جامع ترمذی)

اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے۔ وہ اگر چاہے تو بغیر کسی عمل کے بھی بندے کو بلند درجہ عطا کر سکتا ہے۔ لیکن حکمت کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے اعمال و احوال کے لحاظ سے جس درجہ کا ہو اُسے اسی درجہ میں رکھا جائے۔ البتہ اللہ تعالیٰ اگر کسی وجہ سے (جسے وہ خود بہتر جانتا ہے) کسی بندے کو بلند درجہ عطا کرنے کا ارادہ کر لے جس کا وہ اپنے اعمال کی بدولت مستحق نہ ہو تو اسے مصائب' تکلیف یا بیماری کے ذریعہ آزمائش میں ڈالتا ہے اور پھر اسے صبر کی توفیق دے کر اعمالِ حسنہ کی کمی کو پورا کر دیتا ہے اور اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ محمد بن خالد السلمی اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی بندۂ مؤمن کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا بلند مقام طے ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنے عمل سے نہیں پا سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی جسمانی یا مالی تکلیف میں یا اولاد کی طرف سے کسی صدمہ یا پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے'

پھر اُس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے' یہاں تک کہ اسے اس بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے جو اُس کے لئے پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے''۔ (مسند احمد' سنن ابی داؤد)

قرآن مجید میں ہے کہ دنیا دھوکے کا سودا ہے۔ یعنی دنیا میں جو خوشحال نظر آ رہا ہے وہ حقیقت میں خوشحال نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تو وہ اس خوشحالی میں اللہ کے احکام کی پابندی کر رہا ہے تو پھر تو اُس کے لئے اجر و ثواب ہے' ورنہ وہی خوشحالی اس کے لئے عذاب کا باعث بن جائے گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عسرت اور پریشانی میں زندگی گزار رہا ہے تو وہ اگر اس حال میں صبر کا رویہ اختیار کرتا ہے اور حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا تو بڑے اجر کا مستحق بنتا ہے' ورنہ بے صبری کا رویہ اُسے بہت بڑے اجر سے محروم کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب دنیا میں مبتلائے مصیبت رہنے والوں کو اُن کے صبر کے بدلہ میں اجر و ثواب سے نوازا جائے گا تو وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں سکھ اور چین کی زندگی گزاری ہوگی' حسرت کریں گے کہ کاش وہ بھی دنیا کی زندگی میں مصائب و آلام میں مبتلا ہوتے رہتے اور آج ان کا اجر پاتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جب ان بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے' ان مصائب کے عوض اجر و ثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام اور چین سے رہے' حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں''۔ (جامع ترمذی)

دنیا کے دکھ اور تکلیف کے بدلے میں ملنے والے اجر و ثواب کے متعلق معلوم ہو جانے کے بعد عسرت' تکلیف اور بیماری کی خواہش کرنا جائز نہیں' کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ مصیبتوں میں مبتلا کر کے ہی گناہ بخشے' وہ تو ہر طرح کا اختیار رکھتا ہے۔ جس کو وہ چاہے بخشے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت طلب کرنی چاہئے' کیونکہ جسم و جان کی حفاظت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ ہاں اگر بندہ مبتلائے مصیبت ہو جائے تو پھر ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (التغابن: ۱۱) ''کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کے حکم سے'' کے پیشِ نظر اس مصیبت کو اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم کی طرف سے سمجھے اور صبر سے کام لے' اللہ کی یاد سے مُنہ نہ موڑے' شکوہ و شکایت نہ کرے' بلکہ اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھے تو یہ صحیح طرزِ عمل ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ معذور لوگ بھی اپنی استطاعت کے مطابق تمام احکامِ خداوندی کے پابند ہیں۔ صرف انہی امور سے مستثنیٰ ہیں جن پر وہ کسی صورت عمل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نابینا صحابی کو بھی مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا ارشاد فرمایا' اگر اس کے کان میں اذان کی آواز سنائی دیتی ہو۔ oo

خطوط و نکات

''خوار از مہجوری قرآن شدی!''

جناب مینیجر صاحب ''حکمت قرآن''

خدا لاکھ لاکھ سلامت رکھے' السلام علیکم!

بعد عرض آداب امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا ماہنامہ حکمت قرآن اکتوبر ۲۰۰۴ء کا ملا' بہت مفید پایا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جو قرآن کے موضوع پر لکھا ہے اس کی تحسین کا بیان ممکن نہیں۔ خدا خیر کی عمر دراز کرے۔ ان کا دوسرا مضمون ''رمضان' روزہ اور قرآن'' حقیقت میں انسان کو بیدار کرتا ہے اور قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے' تو ہر انسان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ ربّ العزت نے یہ تیس پارے قرآن مجید آخر کیوں بھیجا اور اس سے اللہ کا مقصد کیا ہے۔ مگر کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ اور آج یہی وجہ ہے کہ قرآن کے ترک کرنے سے جو ذلت اور رسوائی ہے صرف اور صرف مسلمان کے حصے میں آئی ہے۔ حالانکہ یہ تمام انسانوں کے لئے ایک ضابطۂ زندگی ہے۔ اللہ ربّ العزت اپنی خلقت پر گرانی نہیں ڈالتا بلکہ آسانی چاہتا ہے۔ لیکن آج ہر انسان کے پاس رسالوں' ناولوں' ٹی وی وغیرہ سب کے لئے وقت ہے' مگر قرآن کے لئے وقت نہیں ہے' حالانکہ اللہ اس کے بارے میں پوچھے گا۔ جیسا کہ آیت ہے کہ جس کسی نے میرے قرآن سے اعراض کیا قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ یہ پوچھے گا یا اللہ! مجھے آپ نے اندھا کیوں اٹھایا؟ میں دنیا میں تو بینا تھا۔ اللہ فرمائے گا کہ بندے! تمہارے پاس ہماری آیتیں آئی تھیں' لیکن تم نے ان کو بھلا دیا تھا' آج کے دن اسی طرح تم بھلا دیئے گئے ہو۔

آپ لوگوں نے جو قرآن پاک مع ترجمہ و تفسیر شروع کیا ہے میں بہت زیادہ خوش ہوں۔ امید ہے ان شاء اللہ یہ جاری رکھیں گے' کیونکہ دنیا میں ہماری اشد ضرورت قرآن کا سیکھنا ہے۔ خدا کی قسم آج چودھواں روزہ ہے اور آپ کو یہ کچھ ایسے ویسے الفاظ لکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ مجھے قرآن کی طالبی سے محروم نہ کریں' یہاں تک کہ قرآن پڑھتے پڑھتے موت آ جائے۔ بس یہی خواہش ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے یہ دسواں سال ہے کہ ہمارے بازار میں ایک اللہ والا قرآن معہ ترجمہ و تفسیر' حدیث' روایات و واقعات اور تاریخ

کے پڑھاتا ہے' جس کے ترجمے میں ہر سال سینکڑوں طالب دور دراز سے آتے ہیں اور سارا رمضان قرآن کے گلشن میں سیر و سیاحت کرتے ہیں اور ۲۵ رمضان تک قرآن پاک اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر سارا سال آدھ گھنٹہ صبح اور آدھ گھنٹہ عصر کے وقت وہ اللہ والے آتے ہیں اور قرآن حکیم کے فیوض سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو قرآن کے لئے اپنا وقت دیتے ہیں' حالانکہ آج فتنوں کا دور ہے اور اکثر لوگ اس لطف سے ناآشنا ہیں۔ خدا کرے کہ سب مسلمانوں کو اللہ اپنی محبت' اپنے حبیب ﷺ کی محبت اور اپنے قرآن پاک کی صحیح محبت عطا کریں۔ اور ہمارے سب مسلمانوں کی اللہ مدد فرمائے' دنیا اور آخرت کی بھلائی نصیب ہو۔

اس کے علاوہ نباتات قرآن اپنی جگہ درست ہے مگر اس کے ساتھ طب کی طرح ان کے استعمال کی ترکیب اجزاء اور خواص سے معلوم ہونی چاہئے۔

پروفیسر جنجوعہ ایک اللہ والے آدمی ہیں۔ وہ کبھی کبھار درس حدیث بیان فرماتے ہیں' یہ بھی مستحسن ہے۔ اور خاص طور پر باطل فرقوں اور دیگر فرقوں پر مضمون تو از حد ضروری ہے۔ اور ان پر خاص معلومات قرآن و حدیث کے حوالے سے فراہم ہونی چاہئیں اور فقہی مسائل پر کلام بھی ضروری ہے' مگر رسالہ کم ہے۔

ہر انسان کی اپنی عقل کی رسائی ہے مگر ہم خود تو رسالے کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا آپ کو اور بھی توفیق نصیب کرے کہ مسلمانوں کے سمجھانے کو اور دین کی اہمیت کو جانتے ہوئے کوشش کرتے رہیں۔ اللہ آپ کی یہ مساعی قبول فرمائیں۔ دُعا و سلام!

حاجی فضل رحیم

درہ آدم خیل بازار

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک جامع خطاب

☆ صفحات: 72 ☆ قیمت: 15 روپے

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام مجلّہ : سہ ماہی اسلامائزیشن (جنوری۔مارچ ۲۰۰۴ء)

مدیر اعلیٰ : ظفر اقبال خان

ضخامت : 160 صفحات ۔ قیمت : 50 روپے

ملنے کا پتہ : اسلامائزیشن انسٹیٹیوٹ، حویلی بہادر شاہ، جھنگ

توحید اسلام کا اہم ترین عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کے شرک سے مبرا ہے۔ لیکن خود اسلام کو ماننے والے اور مسلمان کہلانے والے اس عقیدے کے سلسلہ میں طرح طرح کی غلط فہمیوں اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ جب توحید کی صحیح تفہیم نہ ہوگی تو عمل متاثر ہوگا اور طرح طرح کے توہمات کے لئے گنجائش پیدا ہوگی۔ اس گنجائش کا امکان صرف توحید خالص ہی سے ختم کیا جاسکتا ہے، جس کی راہ میں ابلیس سب سے بڑی رکاوٹ ہے، جو چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے عقیدۂ توحید میں کمزوری پیدا کر کے ان پر نجاتِ اخروی کا دروازہ بند کردے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلے کی اہمیت کا احساس کرے اور بلا تعصب قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح نتیجے پر پہنچے۔ عقیدۂ توحید میں رسوخ بہت ضروری ہے، کیونکہ اسی پر دوسرے تمام عقائد کی بنیاد ہے۔ جو شخص عقیدۂ توحید کی اہمیت کو نہ جان سکا وہ ضرور شرک میں مبتلا ہو کر گمراہی میں جا پڑے گا۔ اس کتاب میں توحید کی اہمیت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مسلمان مومن ہونے کے باوجود مشرک نہ بنیں۔ جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے لوگوں میں سے بہت سے مشرک ہیں۔ (یوسف:۱۰۶)

فاضل مدیر نے اس مجلّہ میں عقیدۂ توحید کی اہمیت اور اخلاق وکردار اور اعمال وافعال پر اس کے اثرات بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں۔ مجلّہ ٹھوس دلائل اور مسکت براہین پر مشتمل ہے۔ اس کا مطالعہ ہر طرح کے شکوک وشبہات دور کردے گا۔

(۲)

نام کتاب : ماں کی عظمت

مرتب : مولانا جمیل احمد بالاکوٹی

ضخامت:224 صفحات ۔ قیمت :100روپے

ناشر:القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' خالق آباد' نوشہرہ

ملنے کا پتہ:(1) جامعہ حنفیہ تعلیم القرآن' سرائے عالمگیر

(2) مکتبہ سید احمد شہید'10-الکریم مارکیٹ' اردو بازار لاہور

اسلام میں والدین کو بڑا اونچا مقام دیا گیا ہے۔ والدین میں سے پھر ماں کا درجہ باپ سے بھی بلند قرار دیا گیا ہے۔ ماں باپ کی خدمت سعادت مندی کی علامت ہے جبکہ ان کی ناراضگی انتہائی بدنصیبی ہے۔ ''ماں کی عظمت'' کے مصنف مستند عالم دین' باصلاحیت اہل قلم نوجوان ہیں۔ دس سال قبل جب ان کی والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تو ماں کی جدائی کے صدمے سے متاثر ہوئے اور اپنے جذبات کے اظہار کو کتابی شکل دے دی جو بہت سے نوجوانوں کے لئے پند ونصائح اور عبرت کا باعث بنی۔

کتاب چونکہ پُرخلوص جذبات کے تحت لکھی گئی ہے اور مصنف اہل علم وقلم بھی ہے اس لئے قارئین کے لئے مؤثر اور عبرت انگیز ہے۔ اس کتاب میں ماں کی فضیلت قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ پھر ماں کی خدمت' اطاعت اور عزت واحترام کے نتیجے میں ماں کے مُنہ سے نکلنے والی دعاؤں کے پُراثر واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مختلف مشاہیر کے تاثرات جوانہوں نے اپنی اپنی والدہ کے بارے میں بیان کئے ہیں' وہ بھی شامل اشاعت ہیں۔ اس کے علاوہ ماں کے نافرمانوں کے چند عبرتناک واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ موضوع سے متعلقہ نظموں پر مشتمل ہے۔

کتاب کا کاغذ سفید' جلد مضبوط اور ٹائٹل خوبصورت ہے تاہم کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ نظر ثانی کے بعد اغلاط کو دور کرنا ضروری ہے۔

(۳)

نام کتاب : لقاں جی

مصنف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ضخامت:132 صفحات ۔ قیمت :درج نہیں

ملنے کا پتہ: القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' برانچ پوسٹ آفس' خالق آباد' نوشہرہ

مولانا عبدالقیوم حقانی معروف عالم دین' کئی کتابوں کے مصنف اور صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ابتدائی زندگی عسرت اور ناداری میں گزری' والد صاحب کا سایہ تو کم سنی ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا' ماں نے تربیت کی۔نہایت ہی نامساعد حالات میں اُن کی والدہ عزم و استقلال کا پہاڑ بنی رہیں۔عبدالقیوم حقانی جو اپنوں کی سرد مہری بلکہ عداوت کا نشانہ تھا' اسے عظیم ماں میسر آئی جس نے قدم قدم پر اپنے بیٹے کی راہنمائی کی۔نہ تو خود صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا اور نہ بیٹے کو دل برداشتہ ہونے دیا۔قدرت نے یاوری کی۔یہ یتیم بچہ ماں کی شفقت کے سہارے علم دین کی تحصیل میں لگ گیا اور آج اس کا شمار ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔مولانا کو اپنی عظیم ماں کے احسانات یاد آئے تو انہوں نے قلم تھاما اور اپنی والدہ کے حوالے سے اپنی رودادِ حیات رقم کر دی جس نے ''لقاں جی'' کے عنوان سے کتاب کی شکل اختیار کر لی۔

کتاب ایک پُرخلوص اور باہمت خاتون کی سبق آموز داستان حیات ہے جس نے بے سروسامانی' عسرت اور ناداری کے باوجود اپنے چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کی پرورش انتہائی حکیمانہ انداز میں کی اور باقیاتِ صالحات کا عظیم خزانہ چھوڑ کر راہیٔ ملک عدم ہوئی۔یہ کتاب کمزور اور بے سہارا لوگوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی' کیونکہ اس میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آ رہی ہے کہ انسان عزم و ہمت اور صبر سے کام لے کر ہر مشکل میں پورے خلوص کے ساتھ اپنے خالق و مالک کو پکارے تو اُس کو کبھی مایوسی نہیں ہوتی۔

کتاب کی کمپوزنگ معیاری' ٹائٹل خوبصورت اور جلد مضبوط ہے۔

بقیہ: ترجمۂ قرآن مجید

فَأُمَتِّعُهُ : تو میں فائدہ اٹھانے کے لئے دوں گا اس کو (بھی)
قَلِيلًا : تھوڑا سا سامان
ثُمَّ : پھر
أَضْطَرُّهُ : میں مجبور کروں گا اس کو
إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ : آگ کے عذاب کی طرف
وَبِئْسَ : اور وہ بہت ہی برا
الْمَصِيرُ : لوٹنے کا ٹھکانہ ہے

نوٹ (۱) البقرۃ کی آیت ۱۲۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی نسل میں امامت کے لئے سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ نافرمانوں کو نہیں ملے گی۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ نے صرف مؤمنوں کے لئے رزق کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے تصحیح فرما دی کہ امامت اور چیز ہے' رزق کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے' اس لئے رزق مؤمن' کافر سب کو دیا جائے گا۔

چلڈرن قرآن سوسائٹی کے زیر اہتمام
طالب علموں کے لئے ایک معیاری علمی رسالہ
ماہنامہ **کوثر** لاہور
حکومت پنجاب سے منظور شدہ SO(PI)45/83
سلسل اشاعت کا کیسویں سال
مستقل عنوانات: آپس کی باتیں' سرورق کی زبانی' حمد' نعت' درس قرآن' تاریخ اسلام' منتخب تحریر' مکالمہ' صحت ..... اس کے علاوہ ہر تازہ شمارے میں تازہ بتازہ مضامین
☆ قیمت فی شمارہ: 10 روپے ☆ سالانہ زرتعاون: 100 روپے
تعارف کے لئے آئندہ شمارہ مفت طلب کریں
چلڈرن قرآن سوسائٹی
خواجہ آرکیڈ' 17۔ وحدت روڈ لاہور فون: 7598565

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم رضؓ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا' آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں
'کا مطالعہ' کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص: 38 روپے' اشاعت عام: 22 روپے

مکتبہ خدام القرآن

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501